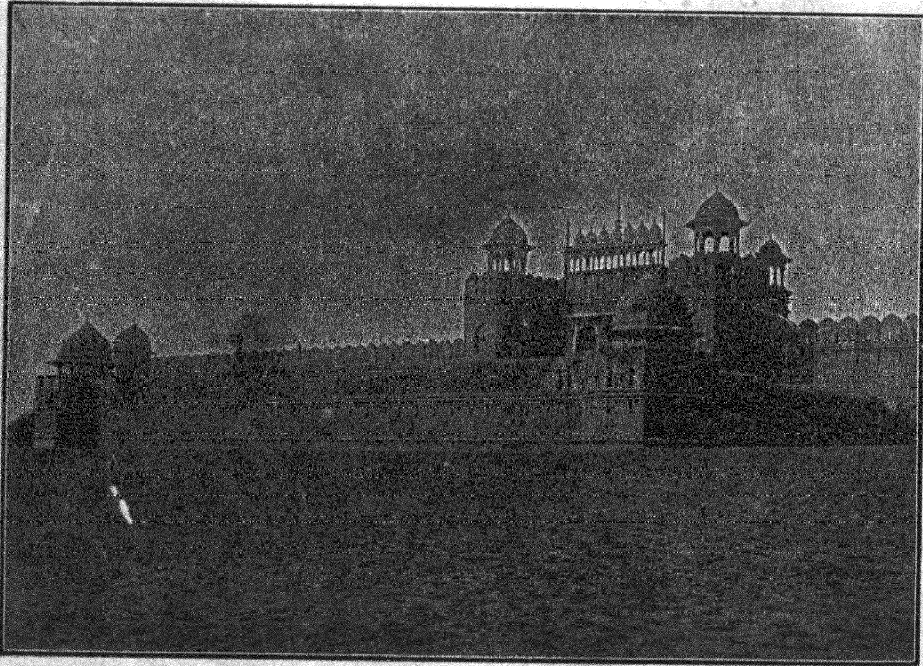
جلد چہارم | اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء | حصۂ شانزدھم

اُردو



انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین



سب رس

اردو نثر کی ایک قدیم کتاب

(از مولوی عبدالحق صاحب بی-اے اڈیٹر)

اردو زبان کے تذکرہ نویسوں نے اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب شاہ فضل الله فضلی کی دہ مجلس بتائی ہے جو کربل کتھا کے نام سے بھی مشہور ہے-یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں لکھی گئی-اس وقت تک کوئی دوسری کتاب نثر کی دریافت نہیں ہوئی تھی اس لئے تقدم کا فخر اسی کو حاصل ہوا-میں ایک مدت سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لئے سامان بہم پہنچا رہا ہوں-اس تحقیق و جستجو میں بہت سی قدیم نظم و نثر کی ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بالکل نایاب ہیں اور ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں-ان میں سے ایک کتاب سبرس ہے-ان صفحات میں میں اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں—

اس کتاب کے مصنف مولانا وجہی ہیں جو سلطان عبدالله قطب شاہ کے متوسلین میں سے تھے-سلطان عبدالله قطب شاہ بن سلطان محمد قطب شاہ سنہ ۱۰۳۶ ہجری میں تخت نشین ہوئے اور سنہ ۱۰۸۳ ہجری تک سریر آرائے حکومت رہے-قطب شاہی بادشاہ خود صاحب علم تھے اور اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے-سلطان عبدالله قطب شاہ بھی اپنے زمانہ میں اہل ہنر کا بہت بڑا سرپرست تھا-برہان قاطع انہیں کے نام سے تالیف ہوئی اور اور بعض کتابیں بھی اس عہد میں لکھی گئیں-سب رس بھی وجہی نے سلطان ہی کی فرمائش سے تصنیف کی-جس کی کیفیت میں خود مصنف ہی کے الفاظ میں آگے چل کر بیان کرونگا-افسوس ہے کہ مصنف نے کتاب میں کہیں سنہ تصنف نہیں لکھا-مجھے اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہوئے-ایک کئی سال ہوئے حیدرآباد میں ملا اور دوسرا بیجاپور میں-دونوں نسخے خوش خط اور بہت صاف ستھرے لکھے ہوئے ہیں جس سے مجھے مقابلہ اور صحت میں بہت مدد ملی-یہ دونوں نسخے تقریباً ایک صدی بعد کے لکھے ہوئے ہیں ایک نسخے کے آخر میں سنہ کتابت کے ساتھ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے—

"الحمدالله که نسخۂ سبرس پچیسویں جمادی الاول سنہ ۱۱۷۱ ہجری روز

اتوار در قلعۂ مبارک دولت آباد تمام ہوئی - تصنیف میاں وجہی قدس سرہ - بخط فقیر پر تقصیر محمد واصل حیدری بجہۃ یادگارے نوشتہ شد ...... "

دوسرے نسخے کے آخر میں یہ الفاظ ہیں —

" تمت الکتاب بعون اللہ ملک الوہاب بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم چہارشنبہ سنہ ۱۱۷۷ ہجری نبویہ "

سلطان عبداللہ ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ کے بعد کی تصنیف ہے - یعنے فضلی کی دہ مجلس سے تخمیناً ایک صدی قبل کی سمجھنی چاہئے - غواصی بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر اور میاں وجہی کا ہم عصر ہے - اس کی مثنوی طوطی نامہ کا سنہ تصنیف ۱۰۲۷ ہجری اور ایک دوسری مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ ہجری ہے - سب رس بھی اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہے —

اگرچہ اس سے قبل کی بھی نثریں ملتی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر مذہب یا تصوف سے ہے لیکن یہ کتاب ہر حیثیت سے بہت عجیب و غریب ہے اور بعض خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتی ہے - ایک تو یہ کہ اول سے آخر تک ایک مسلسل قصہ ہے دوسرے اس میں ادبی شان پائی جاتی ہے اور اس زمانے کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے - تیسرے شروع سے خاتمے تک مقفیٰ عبارت میں لکھی ہوئی ہے - یہ یقیناً فارسی کا اثر معلوم ہوتا ہے - ملا ظہوری کی سہ نثر جو ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس کی تقریظ یا دیباچہ ہے اس سے قبل تصنیف ہو چکی اور شہرت پا چکی تھی - اس کتاب (سب رس) کو دیکھتے ہی رجب علی سرور کی مشہور کتاب فسانۂ عجائب کا خیال آتا ہے - ظہوری کے تکلفات اور استعارات و تشبیہات کی پیچیدگیاں اور اس کی بلند پروازی ایسی ہے کہ سہ نثر کا ان کتابوں سے مقابلہ کرنا گویا ایک پہاڑی ندی کا باغ کی نہر سے مقابلہ کرنا ہے - تاہم فسانۂ عجائب تکلف و تصنع سے خالی نہیں اور نثر میں قافیہ کا التزام بذات خود ایک ایسی چیز ہے کہ تکلف اور آورد کے بغیر چارہ نہیں - مگر اس پر بھی سب رس کا بیان فسانۂ عجائب کے مقابلے میں بہت سادہ ہے - یہ اور بات ہے کہ بعض پرانے الفاظ اور محاورے اس وقت سمجھ میں نہیں آتے لیکن سادہ بیانی - عبارت کی روانی اور سلاست میں کلام نہیں —

رہا قصہ سو برائے نام ہے - اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں - وہ چند صفحوں میں آسکتا ہے لیکن کتاب کا حجم ۲۷۶ صفحے ہے اور ہر صفحے میں ۱۷ سطریں ہیں - یہ عام قصوں سے بالکل الگ ہے - ملا وجہی نے مجاز سے حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے اور حسن و عشق کی کش مکش اور عشق اور دل کے معرکے کو قصے کے پیرائے میں

بیان کیا ھے- جو کتاب سے الگ کر لیا جائے تو چند صفحوں سے زیادہ نہیں- لیکن ھے یہ کہ ملا صاحب نے جگہ جگہ پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ھے اور کہیں کہیں تصوف کے اسرار جو ھمارے ھاں اب معمولی باتیں ھوگئي ھیں بیان کرنے شروع کر دئے ھیں- یہ بھی نہیں کہ دس پانچ سطریں لکھ دیں بلکہ صفحے کے صفحے رنگ دئے ھیں- باتیں معقول ھیں صاف ستھري ھیں- نصیحتیں کام کي ھیں- بیان اچھا ھے لیکن قصے میں جب وعظ شروع کر دیا جائے تو قصے کا لطف کم ھو جاتا ھے اور پڑھنے والے کو الجھن ھوتی ھے- مثلاً عقل کا ذکر آیا تو عقل کی تعریف میں کئی صفحے لکھ ڈالے- شہزادے کی شراب نوشی کا بیان آیا تو شراب کی تعریف اور بادشاھوں کے لئے مکر و ریا کے مقابلے میں اس کے جواز پر بحث شروع کر دي- عشق کے مقام پر عشق پر گفتگو چھیڑ دي- کہیں حیا کی مدح اور سوال کرنے کی مذمت میں- کسی جگہ آب حیات کی خاصیت اور تعریف میں- کسی مقام پر ھمت کی تعریف میں- کہیں طمع کی برائی میں- کسی جگہ عشق- عاشق اور معشوق پر طویل بحثیں کرنے لگتے ھیں- اسی طرح مصیبت- فقر اور صبر- خواب- لڑائی اور بہادري- مشیروں اور مصاحبوں کے انتخاب- عورت کی محبت- سوکن کے جلاپے- بادشاھت کے فرائض وغیرہ پر اپنے خیالات بے تکلف لکھتے چلے گئے ھیں- اگر ان تمام مباحث کو الگ نکال لیا جائے تو مضامین وجہی کی اچھی خاصی کتاب تیار ھو سکتی ھے- میرا قیاس ھے کہ یہ کتاب اس زمانے میں بہت مقبول ھوئی اور لوگ صرف قصے کی خاطر نہیں بلکہ پند و موعظت کی کتاب سمجھ کر اسے شوق سے پڑھتے تھے چونکہ عبارت اس کی مقفی اور آسان اور سلیس اور روزمرہ کی گفتگو میں تھی اس لئے عام و خاص اسے پڑھ کر ضرور خوش ھوتے ھونگے—

اصل قصہ یہ ھے

نقل ھے کہ ایک شہر تھا جس کا نام تھا سیستان- وھاں کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام عقل تھا- عقل کے ایک بیٹا تھا دل نام- جو شراب بہت پیتا تھا- ایک روز عالم مستی میں ایک ندیم نے آب حیات کا قصہ پڑھ کر سنایا اور اس کی تعریف کے پل باندھ دئے کہ جو کوئی اسے ایک دفعہ بھی پی لیگا تو موت سے نجات پائیگا اور خضر کی طرح ھمیشہ زندہ و سلامت رھیگا- شہزادۂ دل کو اس کا اشتیاق پیدا ھوا اور یہ دھن سمائی کہ جس طرح ھو اسے حاصل کیجئے- بغیر آب حیات کے زندگی عبث ھے دن رات اسی فکر میں رھنے لگا- دل کی بیقراری بڑھنے لگی اور عشق کی سی کیفیت پیدا ھونے لگی—

اس حال سے مصاحب- مشیر- دوست- آشنا- راجا پرجا سب حیران پریشان تھے اور کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی- شاھزادے کا ایک جاسوس تھا نظر نام- وہ ھر مقام پر

پهنچتا اور جگه جگه کی خبر رکھتا تھا بہت هوشمند اور صاحب فراست تھا اور هر کام کے کرنے میں مستعد-جہاں کوئی نه جا سکے وهاں وہ جائے-جو کام کوئی دوسرا نه کر سکے وہ کر کے لائے-وہ حضوری میں حاضر هوا اور عرض کی که حضور مایوس نہوں-یه جان نثار جاتا هے اور آب حیات کی خبر لاتا هے-شہزادہ یه سن کر بہت خوش هوا اس کی محبت اور اخلاص کی تعریف کی-گلے لگا یا اور خوشی خوشی اجازت دی—

اجازت لیکر نظر چلتا هوا اور چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچا جو بہت خوشحال اور سرسبز تھا اور لوگ وهاں کے بہت با سلیقه اور مہذب تھے-شہر کا نام پوچھا تو معلوم هوا که اسے عافیت کہتے هیں اور یہاں کے بادشاہ کا نام ناموس هے-لیکن دل میں یه دگدا تھی که جس کام کے لئے اس نے یه کھکھیڑ اٹھائی هے وہ کیونکر پورا هو-آخر سوچتے سوچتے وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر هوا-بادشاہ اس کی طرز و روش کو دیکھ کر بہت خوش هوا-اپنے پاس بٹھایا اور احوال پوچھا اول اول اسے دلی مقصد بیان کرتے حجاب معلوم هوا-آخر شرم کو بالائے طاق رکھه کر منه پھوڑ کر بولا که جہاں پناہ! میں آب حیات کی تلاش میں گھر سے نکلا هوں-یہاں تک آیا هوں شاید امید بر آئے-اس کے بعد بادشاہ کو سلام کر کے رخصت هوا لیکن بہت ملول اور رنجیدہ تھا اور کوئی تدبیر سوجھه نہیں پڑتی تھی-لیکن خدا سے امید تھی که کوئی نه کوئی صورت نکل آئیگی—

اتنے میں ایک پہاڑ دیکھا جو بہت بلند تھا اس کے پاس گیا اور وهاں لوگوں سے پوچھا که یه کیا جگه هے اور یہاں کون رهتا هے-جواب ملا که یه پہاڑ زهد و رزق کا مقام هے وهاں جانا بہت کٹھن هے-وهاں ایک بڈھا رهتا هے جو بہت بزرگ اور الله والا هے-اس کا نام رزق هے-غرض وہ اس پہاڑ پر چڑھا اور رزق کے پاس پہنچکر سلام علیکم کہا-اس نے سلام کا جواب دیا-رزق نے پوچھا تم یہاں کیسے آئے اور کس نے تمہیں یه رسته دکھایا اور تمہارا کیا نام هے-نظر نے اپنا مطلب بیان کیا اور آب حیات کی تلاش کا قصه کہا-رزق نے فرمایا که آب حیات جس کی تلاش میں هے نه کسی باغ میں هے نه کسی کشت زار میں-البته یه سنا هے که بہشت میں هے-اسے تم یہاں کہاں پاؤ گے--

آخر وهاں سے بھی مایوس هوکر چلا-چلتے چلتے جنگل میں ایک کوٹ دیکھا جو سر بفلک تھا اور مشرق سے مغرب تک پھیلا هوا تھا-اس کوٹ کے پاس جاکر لوگوں سے پوچھا که اس کوٹ کا کیا نام هے اور یہاں کا بادشاہ کون اور کیسا هے-لوگوں نے جواب دیا که اس کوٹ کا نام هدایت اور بادشاہ کا نام همت هے-یه سنکر اسے کسی قدر ڈھارس هوئی که بارے همت کے پاس تو پہنچ گیا-شاید یہاں مراد بر آئے-همت کے پاس پہنچکر عرض کیا که آپ صاحب دولت-صاحب نصرت اور بادشاہ مملکت هیں

آپ کا نام ھمت ھے-میرا مقصد برلائیں اور مجھے میرے مطلوب تک پہنچائیں-ھمت اسے خلوت میں لے گیا-بہت کچھہ تسلی دلاسا دیا اور سارا حال سنکر کہا کہ تو ثابت قدم اور باوفا شخص ھے جو میں کہوں سن اور میری بات گرہ میں باندہ-شاید اپنا مقصد پائے-مشرق میں ایک ولایت ھے وھاں کے بادشاہ کا نام عشق ھے-ھر دل میں اس کا گھر ھے-سب سے اس کا اتفاق ھے اور کسی سے بگاڑ نہیں-لیکن وہ نہایت بے پروا اور سرمست ھے-وہ ایک آگ ھے جو بجھہ نہیں سکتی اور ایک پھانس ھے جو نکل نہیں سکتی اس بادشاہ کی ایک بیٹی ھے-بہت خوش رنگ-بہت خوش ڈھنگ چندے آفتاب-چندے ماھتاب-جس کے عشق میں ہزاروں مجنوں و فرھاد ھیں-کوہ قاف کے ادھر ایک شہر ھے اور اس شہر میں ایک باغ ھے جو تر و تازگی اور شادابی میں رشک بہشت ھے-شہر کا نام دیدار اور باغ کا نام رخسار ھے-باغ میں ایک چشمہ ھے جس کا نام جگ جیون ھے-پانی اس کا مصری سے میٹھا ھے-اسی چشمے سے تجھے آب حیات ملے گا اور وھیں تو اپنا مقصد پائیگا اور عشق کی نازنین بیٹی حسن بہت ناز و انداز سے چاند سی سہیلیوں کے ساتھہ یہاں سیر کرتی اور اس چشمے سے پانی پیتی ھے—

ھمت یہ کہ کر خاموش ھو گیا-نظر یہ سنکر بیخود رہ گیا-دونوں بیخود و بیہوش ھو گئے ایک کو ایک کی سدت نہ رھی-کچھہ دیر بعد دونوں کو ھوش آیا-حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے-آخر ھمت نے کہا کہ اب میں تجھہ سے کیا کہوں اور سچ یہ ھے کہ چپ بھی نہیں رھا جاتا-تو عاقل و دانشمند ھے-صاحب فراست اور ھوشیار ھے-لیکن شہر دیدار تک پہنچنا بہت دشوار ھے-رستے میں بڑی بڑی آفتیں ھیں-آگے چل کر ایک شہر ھے جس کا نام سبکسار ھے جس کا نام دیو رقیب نامی ھے مگر عشق بادشاہ کے تحت میں ھے-وہ دیدار شہر کا نگہبان ھے اور اغیار کو شہر میں آنے نہیں دیتا-تمہاری مجال نہیں کہ وھاں گھسنے پاؤ-البتہ وھاں میرا ایک سگا بھائی ھے جس کا نام قامت ھے-وہ بہت قبول صورت بلند بالا ھے-میں اس کے نام ایک سفارشی خط لکھے دیتا ھوں اور اس میں تیرا سارا قصہ بیان کئے دیتا ھوں-یہ رقعہ اسے دینا-وہ تجھے ساری اونچ نیچ سمجھا دیگا اور تیرے کام میں مدد دیگا—

نظر یہ رقعہ لیکر بہت شکر و احسان کے ساتھہ رخصت ھوا اور توکل بخدا مشرق کی طرف رخ کیا-کچھہ دنوں کے سفر کے بعد شہر سبکسار میں پہنچا-رقیب کے ملازموں نے جب دیکھا کہ ایک نیا آدمی شہر میں آیا ھے تو اسے پکڑ کر اپنے آقا کے پاس لے گئے-اس نے پوچھا کہ تو کون ھے؟ اور یہاں تیرا کیا کام ھے؟ نظر نے دیکھا کہ معاملہ ٹیڑھا ھے بات بنا کر جھٹ بولا کہ میں حکیم ھوں اور میری حذاقت دور دور مشہور ھے حکمت

کے تمام گروں میں ماہر ہوں-چاہوں تو مٹی کو سونا کر دکھاؤں-رقیب روپیہ کا بہت لالچی تھا یہ سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس کی ملاقات کو بہت غنیمت سمجھا-طمع نے فولاد کو موم کر دیا اور نظر سے سونا بنانے کی فرمائش کی-نظر نے جواب دیا کہ اس کے لئے چند دواؤں کی ضرورت ہے-شہر دیدار اور گلشن رخسار یہاں سے قریب ہے وہاں ہم تم مل کر چلیں گے اور دوائیں تلاش کریں گے-خدا نے چاہا تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا-رقیب لالچ کا مارا اس کے جھانسے میں آگیا-دونوں مل کر شہر دیدار کی طرف چلے-غرض دونوں اس شہر میں پہنچے-قامت نے جو نظر کو رقیب کے ساتھ دیکھا تو چھپ کر اس کا حال پوچھا-نظر نے همت کا رقعہ قامت کو دیا قامت مضمون خط پڑھ کر بہت خوش ہوا-قامت کا ایک غلام تھا سیم ساق-اسے حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے نظر کو آنکھ بچا کر ایک طرف لے جا اور جا کر کہیں چھپا دے--
سیم ساق نے اسے فرش فرح بخش کے آسرے میں چھپا دیا-رقیب نے جب دیکھا کہ نظر غائب ہو گیا تو بہت جھلایا-ادھر ادھر تلاش کیا کہیں نہ پایا تو اپنی حماقت پر بہت افسوس کیا اور پریشان ہو کر اپنے شہر واپس چلا آیا-رقیب جب دفع ہوا تو نظر قامت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا بہت بہت دعائیں دیں-پھر کہا کہ مجھے شہر دیدار کی دھن لگی ہوئی ہے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا-اجازت دیجیے-قامت نے بخوشی اجازت دی--

اب نظر قامت کو سلام کر کے رخصت ہوا اور شہر دیدار کی طرف چلا-بہزار دقت و محنت شہر دیدار نظر آیا-رخسار باغ میں پہنچا تو خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا-شہر دیکھا تو بہشت کا نمونہ پایا-دل باغ باغ ہو گیا-قضا کار حسن کی ایک سہیلی جس کا نام لٹ تھا عجب ناز و انداز سے اس باغ میں سیر کرتی ہوئی پہنچی-تپش سے بچکر سائے میں جو آئی تو یکایک اس کی آنکھ نظر پر پڑی-بیٹھی تھی تو ایک دفعہ ہی اٹھ کھڑی ہوئی-نظر سے پوچھا تو کون ہے اور یہاں تیرا آنا کیسے ہوا؟ اس باغ کا پتہ تجھے کس نے بتایا-یوں حیران و ششدر کیوں کھڑا ہے؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ نظر نے آخر اپنا سارا حال من و عن بیان کیا اور بہت منت و عاجزی کی اور کہا کہ مجھ پر یہ بپتا پڑی ہے مصیبت زدہ ہوں یہاں تک آگیا ہوں-اب میری بات تیرے ہاتھ ہے-اس نے نظر کے عجز و الحاح کو دیکھ کر بہت مہربانی کی اور کہا غم نہ کر خدا پر بھروسہ رکھ-پھر اسے ساتھ لے گئی کچھ دنوں کے بعد رخصت کیا-چلتے وقت اپنے کچھ بال دئے کہ جب تجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو یہ بال آگ پر رکھ دینا میں فوراً تیری مدد کو آجاؤں گی--

لٹ سے وداع ہوکر نظر نے شہر دیدار کی طرف چلنے کا قصد کیا اور تھوڑی دیر میں رخسار گلزار نے ایک مقام پر پہنچا اور وہاں راحت و آرام پایا-اتنے میں

اس نے کچھ حبشی بچے دیکھے اور انہوں نے اسے دیکھا - نظر نے پوچھا تم کون ہو - کیا نام ہے اور کیا کام کرتے ہو؟ جواب دیا کہ حسن نازنین نے حبش سے ایک تل (لونڈی) بلائی تھی - تل بڑی ساحرہ ہے اور عاشقوں پر اس کا بہت ظلم ہے - ہم سب اسی کے غلام ہیں اور اس باغ کی نگہبانی کرتے ہیں چمن چمن میں پانی دیتے پھرتے ہیں - یہاں کے سب پھول پھل ہماری نگرانی میں ہیں —

نظر کا ایک بھائی تھا بہت خوش فہم اور زیرک وہ لڑکپن ہی میں جدا ہو گیا تھا اور کہیں چلا گیا تھا - غمزہ اس کا نام تھا - اتفاق ایسا ہوا کہ وہ حسن کی خدمت میں ملازم ہو گیا قسمت کی بات ہے کہ غمزہ اس گلزار میں مست پڑا تھا مگر ہوش حواس درست تھے سب پر نظر رکھتا تھا - جب اس نے نظر کو دیکھا تو اسے مطلق نہ پہچانا سمجھا کوئی بیگانہ ہے - اٹھ کھڑا ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال کر اس کے سامنے آیا اور پوچھا تو کون ہے اور اس باغ میں کیوں آیا ہے؟ یہاں تیرا کیا کام ہے؟ یہ کہتے ہی اسے گرفتار کر لیا - آنکھیں باندھ دیں - کپڑے اتار لئے اور چاہتا تھا کہ سر قلم کر دے مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا - ان بھائیوں کی ماں نے دونوں کو دو لعل دئے تھے اور ان کے بازوؤں پر باندھ دئے تھے تاکہ کوئی وقت پڑے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں - غمزے کی نظر جو نظر کے بازو پر پڑی تو لعل کو پہچان لیا - تب سمجھا کہ یہ تو اپنا بھائی ہے - بہت رویا گلے لگایا اور عذر خواہی کی اور کہا کوئی کیا کہ سکتا تھا کہ ہم بچپن کے بچھڑے ہوئے اس طرح ملیں گے - یہ خدا کی قدرت ہے - غمزہ نظر کو اپنے گھر لے گیا اور بہت خاطر تواضع کی —

حسن کو بھی اس کی اطلاع ملی کہ غمزے کا بھائی جو بچپن سے بچھڑا ہوا تھا آملا ہے - اس نے غمزے کو بلا کر اس کے بھائی کا احوال پوچھا کہ تیرے بھائی کا کیا نام ہے اور کیا کام کرتا ہے؟ غمزے نے کہا کہ میرے بھائی کا نام نظر ہے اور بہت کامل آدمی ہے - پھر پوچھا کہ کیا ہنر جانتا ہے اس نے کہا کہ جواہرات خوب پرکھتا ہے حسن کے پاس ایک عجیب و غریب جواہر تھا جس کی جوت سے سارا مکان روشن ہو جاتا - کہنے لگی کہ بہت دنوں سے اس سوچ میں تھی کہ کوئی جوہر شناس آئے تو اسے دکھاؤں - بارے الحمدللہ ایسا جوہر شناس آدمی آگیا - یہ سن کر غمزہ دوسرے روز نظر کو ساتھ لایا اور حسن کے حضور میں حاضر کر دیا - حسن کو نظر کی روش بہت بھائی - نظر نے سلام کیا - حسن نے جواب دیا - خزانہ دار کو بلایا اور اس لعل خوش رنگ کے حاضر کرنے کا حکم دیا - وہ دوڑا ہوا گیا اور تورت لیکر آیا - نظر نے جو اسے دیکھا تو عقل دنگ رہ گئی - اس جوہر میں جو بات تھی کہہ سنائی اور عرض کیا کہ یہ پاک صورت یہاں کیونکر آئی - اس صورت کا نام دل ہے - پھر سارا احوال کہہ سنایا اور راز کی باتیں کھول کے بیاں کر دیں - یہ حالات سنکر حسن کے دل پر ایسا

اثر ہوا کہ دل پر جان سے فریفتہ ہو گئی اور عشق کا جادو چل گیا —

اب نظر حسن کا بھی راز دار ہو گیا - کہنے لگی کہ جیسے تو نے مجھے دل پر عاشق کیا ہے اب اس کے ملنے کی بھی فکر کر - نظر نے کہا دل کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے - وہ اپنے جی کا مالک ہے کسی کا اسپر بس نہیں چلتا - دل اسی سے ملتا ہے جو دل ملانا جانتا ہے - جو دل سے دل ملانا جانتا ہے وہی دل کو پاتا ہے - تو نے جو دل سے دل لگایا ہے تو تجھے بھی زیبا ہے - دل کو بھی حسن بہت بھاتا ہے - لیکن دل کو تیرے پاس لانا آسان نہیں - خون جگر کھانا ہے - ایک بادشاہی میں خلل ڈالنا ہے - اسمیں جان کا خطرہ ہے - عقل بادشاہ جو دل کا باپ ہے اس نے اسے تن کوٹ مین قید کر رکھا ہے - نہ کہیں آنے دیتا ہے نہ جانے دیتا ہے - دل اس بات سے بہت خفا ہے - لیکن بزرگ جو کرتے ہیں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں - اس میں انہیں کا بھلا ہے - وہ بہت سعادتمند ہے ماں باپ کا بہت ادب کرتا ہے لیکن اے حسن اس درد کا درمان بھی تیرے ہاتھ ہے اس گھاؤ کا مرہم بھی تیرے ہی پاس ہے ایک زمانے سے دل کو آب حیات کی لگن لگی ہوئی ہے اور اس کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے - اگر تو میری مدد کرے اور کوئی معتبر آدمی میرے ساتھ دے تو آب حیات ڈھونڈھ کر لاؤں - پھر دل تیرے ہاتھ آجاتا ہے - دونوں کا مقصد پورا ہوتا ہے —

حسن کے پاس ایک غلام تھا جو پل بھر میں مشرق سے مغرب تک ہو آئے اور آسمان - زمین - عرش کرسی کی خبر لے آئے - تیزي میں ہوا اس کے سامنے گرد اور عقل و فراست میں اس کا نظیر نہ تھا - نام اس کا خیال تھا - حسن کے پاس یاقوت کی ایک انگوٹھی تھی جس سے آب حیات کے چشمہ پر مہر کی جاتی تھی - وہ اس نے خیال اور نظر کے حوالے کی اور کہا کہ یہ مہر نشانی لیکر جاؤ - دل کو دکھاؤ اور اسے جس طرح ہو سکے میرے پاس لاؤ —

خیال اور نظر حسن سے رخصت ہو کر تن شہر کو چلے کچھ مدت کے سفر کے بعد وہاں پہنچے - دل بادشاہ کے دیدار سے مشرف ہوئے اور تمام حقیقت بیان کی اور دل کو خوشخبری دی - دل نے نظر کو بہت سرافراز کیا اور اس کی ہمت پر بہت آفریں کی - انگوٹھی کو چوما سر آنکھوں پر رکھا سارا دن اور ساري رات وہی باتیں کرتا رہا اور ذرا نہ اکتایا - خیال کی بھی بہت خاطر مدارات کی اور پوچھا کہ تم کیا کام کرتے ہو - اس نے کہا میں نقاش ہوں صورت نویسی میں شہرۂ آفاق ہوں دل نے کہا اچھا میں بھی ذرا تیرا ہنر دیکھوں - خیال نے قلم ہاتھ میں لی اور فوراً حسن کی صورت کھینچ کر دکھا دی - دل یہ صورت دیکھ کر دل و جان سے عاشق ہو گیا اور سدہ بدہ کھو بیٹھا - حالت نازک ہو گئی خواب و آرام حرام ہو گیا - صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہا - بس دن رات حسن ہی کی دھن رہنے لگی —

آخر خیال اور نظر سے مشورہ کر کے دل نے شہر دیدار کا عزم کیا-اس وقت دل کا وزیر وہم نامی تھا-جب اس نے سنا کہ دل جانا چاھتا ھے تو اسے بڑی فکر ہوئی اور سمجھا کہ وہ خیال اور نظر کے جھانسے میں آکر اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مارنا چاھتا ھے-ملک خراب ہو جائیگا اور رعایا برباد ہو جائیگی-اس نے فوراً بادشاہ عقل سے ساری باتیں جا لگائیں کہ نظر جو شہر سے غائب تھا ایک خانہ خراب خیال کو ساتھ لایا ھے اور دونوں مل کر شہزادۂ دل کو شہر دیدار کی طرف لیجانا چاھتے ھیں-یہ ضرور کوئی فتنہ پیدا کریں گے اور ملک میں خلل ڈالیں گے-جو تدبیر کرنی ہو جلد کر لیجئے ورنہ وقت ھاتھ سے نکل جائیگا-میری بات مانئے-ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عشق بادشاہ آپ سے لڑے گا اور سلطنت میں ابتری پڑ جائیگی-ابھی اس سے صلح ہوئی ھے-قول قرار ہوئے ھیں-باھم اخلاص و محبت ھے-اس کے بعد جھگڑا ہوا تو برا ہوگا-عشق بادشاہ بہت قوی ھے اس کا مقابلہ آسان نہیں-ایک جان نثار اور وفادار بندے کا فرض ھے کہ وہ آقا کو اونچ نیچ سمجھادے-اس موقع پر چپ رھنا نمک حرامی ھے-عقل بادشاہ نے یہ سن کر وھم کو گلے لگا لیا اور اس کی خوش فہمی اور وفاداری سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ جو کچھ تونے کہا ھے وہ سب درست اور معقول ھے اور فوراً لشکر بھیج کر دل اور نظر کو قید کرنے کا حکم دیا--

یاقوت کی وہ انگوٹھی جو حسن نے دل کو اپنے عشق کی نشانی بھیجی تھی وہ کسی مصلحت سے دل نے نظر کو دیدی تھی-اس میں ایک یہ خاصیت تھی کہ جو کوئی اسے منہ میں رکھ لے تو سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے-وہ سب کو دیکھے اسے کوئی نہ دیکھ سکے-چنانچہ اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر عقل بادشاہ کے بند سے باھر نکل آیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا اور جلد جا پہنچا-سیر کرتے کرتے رخسار کے گلزار میں گزرا-وھاں ایک چشمہ جسے آب حیات کہتے ھیں پایا-لالچ میں آکر چاھتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے کہ وہ انگوٹھی منہ میں سے نکل کر چشمے میں جا پڑی-آب حیات کا چشمہ نظر سے غائب ہو گیا-بہت پچھتایا بہت رنج و ملال کیا مگر کیا ہو سکتا تھا-اتنے میں رقیب کی نظر اس پر پڑی وہ تو تاک میں تھا ھی فوراً پکڑ لیا اور جکڑ کر باندھ لیا اور اپنے گھر لیجا کر قید کر دیا-یہ اپنے کئے کا پھل تھا-بیوفائی کا نتیجہ تھا-چندے اس قید میں بسر کی بہت پریشان حال رھا-کوئی تدبیر رھائی کی نظر نہ آتی تھی-ایک روز یاد آیا زلف (لٹ) نے جو بال دئے تھے ان سے کام لینا چاھئے-ایک دو بال لے کر فوراً آگ پر رکھے-بالوں کا آگ پر رکھنا تھا کہ فوراً زلف آپہنچی اور پوچھنے لگی کہ کیا گزری جو مجھے یاد کیا-کہنے لگا پوچھتی کیا ہو جس حال میں ہوں دیکھ لو-زلف نے کہا غم نہ کھا ھمت بلند رکھ-مصیبت مردوں پر ھی آتی ھے-غرض زلف نے اسے حکمت سے باھر نکالا اور

قید سے ازاد کیا اور رخسار کے گلزار اور شہر دیدار کے رستے پر ڈال دیا- نظر وهاں پہنچ کر حسن سے ملا- حسن دل کے فراق میں بیٹھی انتظار کر رهی تھی- جب نظر کی زبانی تمام حال معلوم هوا تو بہت مغموم اور مایوس هوئی اور غمزہ کو بلاکر کہا کہ تم اور نظر دونوں مل کر جاؤ اور جس طرح بن پڑے تدبیر سے حکمت سے جادو ٹونے سے دل کو یہاں لیکر آؤ—

غرض نظر اور غمزہ چیدہ اور تجربہ کار آدمیوں کو اپنے ساتھه لیکر شہر تن کی طرف سدھارے اور سو منزل کی ایک منزل کر کے بھاگا بھاگ وهاں پہنچے- کہتے هیں کہ نظر جس وقت عقل کے بند میں سے نکل بھاگا تھا تو عقل کو اسی وقت کھٹکا هوا کہ یہ جاکر کچھه نہ کچھه فتنہ برپا کریگا- اس لئے اس نے پہلے هی سے سرحد کے سرداروں کے نام احکام جاری کردئے تھے کہ نظر قید سے بھاگ گیا هے اسے ملک سے باهر نہ جانے دیں- زهد و رزق کا ایک پہاڑ تھا وهاں رزق کا بیٹا توبہ رهتا تھا- اسے خاصکر اس کام پر متعین کیا تھا کہ نظر کو سرحد سے باهر نہ جانے دے- خدا کا کرنا ایسا هوا کہ غمزہ اور نظر دونوں بے خبر رات کے وقت اسی پہاڑ کے تلے پہنچے- اس پہاڑ کے دامن میں ایک پھول باڑی تھی وهاں آرام کیا- جگہ بہت سہانی- رات کے جاگے هوئے تھے خوب نیند آئی—

اتنے میں سورج نے پردۂ شب سے سر نکالا اور دنیا میں اجالا هوا- ابھی پاؤ پاؤ گھڑی دن بھی نہیں چڑھا تھا کہ قلعہ کے دیدبان نے دیکھا کہ نظر لشکر لئے پڑا هے- حیران هوا کہ یہ کیا معاملہ هے- فوراً توبہ سے آکر سارا ماجرا بیان کیا- توبہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور فوراً لشر لے کر نظر اور غمزے پر جاپڑا- شور و غل سن کر نظر اور غمزہ اور ان کے ساتھی یکبارگی آنکھیں ملتے هوئے گھبرا کر اٹھه کھڑے هوئے سامنے فوج دیکھه کر هکا بکا رہ گئے- گرتے پڑتے اٹھے- دشمن نظر اور غمزے پر آکر ٹوٹے- یہ دونوں بڑے بہادر تھے- بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑے اور توبہ کو مار بھگایا- رزق کا جو صومعہ تھا اسے بھی توڑ پھوڑ ڈالا- وهاں سے عافیت کے شہر کی طرف چلے- دونوں بھیس بدل کر قلندر بن گئے اور شہر عافیت پہنچ کر ناموس بادشاہ سے ملاقات کی- ناموس بادشاہ عاشق مزاج تھا- پہلے هی سے جلا بھنا بیٹھا تھا دونوں کو دیکھتے هی مال دولت چھوڑ کر فقیر هو گیا اور ان کے هاتھه میں اسیر هوا- اب چلتے چلتے شہر بدن کے قریب پہنچے- قلندری بھیس اتارا اور اصلی کپڑے پہنے- غمزہ اس وقت شراب کے نشے میں تھا- اس نے اپنے لشکر پر ایسی سیفی پڑھ کر پھونکی کہ سب لشکری هرن بن گئے—

ادھر توبہ غمزے سے شکست کھا کر شہر بدن میں پہنچا اور عقل بادشاہ کی خدمت میں حاضر هوا- آداب بجالایا اور جو کچھه اس پر ظلم و بیداد هوئی تھی

کہ سنا دی۔ بادشاہ نے جب غمزے کی یہ سفاکی دیکھی تو دل کو طلب کیا۔قید سے رہا کیا۔غمزے کی بیدادی کا قصہ سنایا اور کہا کہ حسن کا لشکر بہت بیداد ہے اس میں وفا نہیں۔تم اگر ان دغابازوں کی باتوں پر جاؤگے تو اپنا ملک کھو کے رہو گے۔ اگر تمھیں حسن کی ایسی ہی لو لگی ہے اور اس کے وصال کے شوق میں جنوں ہے تو ہماری بات سنو۔تم ہمارا جرار لشکر لے کر شہر دیدار کے ادھر چلے جاؤ۔اکیلے جانا خطر سے خالی نہیں۔عورت کی ذات بہت مکار ہوتی ہے۔نہ معلوم اس عشق کے حیلے میں کیا گل کھلائے۔دل کو بھی یہ بات بہت پسند آئی اور باپ نے جو کہا تھا بسر و چشم قبول کیا۔ہمت کے گھوڑے پر سوار ہوا۔شاہ عقل کے سپہ سالار صبر کو ساتھ لیا۔سب لشکر دیکھا۔موجودات لی اور شہر دیدار کا رخ کیا۔عقل نے دیکھا کہ میری بات دل کے لئے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوئی تو وہ چند منزل اسے پہنچا نے آیا اور مہر و محبت سے تجربہ اور کام کی باتیں اس کے کان میں ڈالتا رہا۔تھوڑی دیر چلے تھے ساتھ والے خبر لائے کہ اس جنگل میں جگہ جگہ ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں گویا ہوا سے باتیں کرتے ہیں۔مگر ایسے ہشیار اور سمجھدار ہیں گویا آدمی ہیں۔چال ڈھال سب ویسی۔البتہ باتیں نہیں کرتے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنات نے ہرنوں کا بھیس بدل لیا ہے۔دل یہ سن کر بیتاب ہو گیا۔شکار کا شوق سر پر سوار ہوا۔اس پر جوانی کا ولولہ۔تیر کمان لے ہرنوں کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔وہ اصل میں ہرن نہ تھے وہی غمزے کا لشکر تھا انہیں کون پکڑ سکتا تھا۔دور نکل جاتے تو ٹھیر جاتے اور جو دل قریب آتا تو قلانچیں بھر کے آگے نکل جاتے۔اس طرح دل اور عقل دونوں کو اپنے پیچھے لگائے لے گئے۔عقل تھک کر رہ گیا لیکن دل دیوانوں کی طرح جنگل میں بڑھتا چلا گیا۔عقل کی محبت نے جوش مارا اور وہ بھی اسی طرف راہی ہوا۔دونوں ہرنوں کے پیچھے سرگردان چلے اور ہوتے ہوتے دور نکل گئے۔اب نظر اور غمزے نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی طرح دل کو شہر دیدار کے قریب لے جائیں پھر جو ہو سو ہو۔ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ملک میں آتا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔اب معاملہ قسمت کے ہاتھ میں ہے۔غرض اس طرح بہلاتے پھسلاتے شہر دیدار کے قریب لے آئے اور اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے اور حسن کی خدمت میں حاضر ہو کر تسلیمات بجا لائے۔وہ بھی انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور گلے لگا لیا۔ بہت کچھ انعام و اکرام دیا۔۔۔

لیکن اب اس سوچ بچار میں پڑے کہ عقل بادشاہ جو لشکر لئے چلا آرہا ہے اس کی کیا تدبیر کی جائے اور اس آفت کو کیونکر ٹالا جائے۔رائے یہ قرار پائی کہ حسن اپنے باپ کو اطلاع کرے تاکہ وہ اس لشکر کے دور کرنے کا کوئی جتن کرے۔چنانچہ اس نے اپنے باپ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میرا ایک وفادار خوش فہم غلام خیال نامی

مدت سے غائب تھا۔اب یہ معلوم ہوا کہ عقل بادشاہ نے گرفتار کر لیا ہے۔نہ اسے کھانے کو دیتا ہے نہ پہننے کو اور نہ ادھر آنے دیتا ہے۔ہم نے بلا بھیجا تو بہت برہم ہوا اور اب لشکر لئے چڑھا آرہا ہے۔چاہتا ہے کہ شہر دیدار فتح کرے اور اس گلزار پر قبضہ جمائے۔رعایا کو تباہ کرے۔عشق نے جب مکتوب پڑھا مارے طیش کے چہرہ لال ہو گیا اور کہا کہ عقل کی یہ مجال کہ وہ اس سر زمین میں قدم رکھے۔اگر عقل کو اپنے اوپر گھمنڈ ہے تو کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ میں بھی عشق ہوں۔عقل دیوانہ ہے جو عشق سے بھڑنا چاہتا ہے —

غرض عشق نے اپنے بہادر اور مستعد سپہ سالار مہر نامی کو مقابلے کے لئے بھیجا۔اس نے حسب فرمان جہاں پناہ لشکر جرار جمع کیا۔عقل یہ فوج دیکھ کر بہت سٹ پٹایا اور کہنے لگا کہ فرزند کی نالایقی سے آفت باپ پر آتی ہے۔اپنے اس فعل پر بہت پچھتایا۔اتنے میں لڑائی شروع ہو گئی۔غمزے نے عقل پر حملہ کیا۔خوب دو دو ہاتھ ہوئے۔عقل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔دوسرے روز قامت نے عقل کے لشکر میں قیامت برپا کر دی۔تیسرے دن رات کو زلف نے شبخون مارا۔سوتے ہوؤں کو پچھاڑا اور سارے لشکر میں کھلبلی مچادی۔اتنے میں باس آئی۔دل میں اور اس میں بہت محبت تھی۔اس نے دل سے کہا تو رو نہیں میں تمہاری مدد پر ہوں۔لیکن کام بہت کٹھن ہے۔بھاگنا نامردی ہے۔اب سوائے مرنے مارنے کے کوئی چارہ نہیں مردی کا یہی وقت ہے۔دل نے کہا مجھے تجھ سے بہت توقع ہے۔میں بھی دل ہوں لڑنے مرنے میں ثابت قدم ہوں۔مگر حسن و عشق کا لشکر بہت قوی ہے۔چیونٹیوں کی ہاتھی سے لڑائی ہے۔لیکن رن چھوڑنا عاشقوں کو زیبا نہیں۔یہ کہ کر اس نے دو چار خوب زور کے حملے کئے۔عشق کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا۔چوتھے دن بھی یہ ہی آفت برپا رہی۔دونوں لشکر برابر اڑے رہے۔نہ کسی کی جیت ہوئی نہ کسی کی ہار —

حسن کو جب یہ خبر پہنچی بہت گھبرائی۔اپنے خال سے مشورہ کیا۔اس نے کہا کوہ قاف کی پریوں میں تیری ایک ہمزاد ہے۔تجھ سے اسے بہت اخلاص پیار ہے۔بہت ہشیار اور دلیر ہے۔شکل صورت میں بھی لاجواب ہے۔اس کا نام بھی حسن ہے۔تم دونوں نازنین صاحب جمال۔دو چاند۔دو سورج ہو۔اگر تم اور وہ مل کر کام کرو تو عقل پر فتح پانا کوئی بات نہیں۔دل تو خود عاشق ہے۔صرف باپ ہی کو رام کرنا ہے۔حسن نے کہا وہ کوہ قاف میں۔میں یہاں۔اس کے آئے آئے تو یہاں کام تمام ہو جائیگا۔خال نے کہا یہ کوئی مشکل نہیں۔میرے پاس عنبر کا دانہ ہے۔جس وقت اسے آگ پر رکھونگا۔تیری ہمزاد چٹکی بجاتے تیرے پاس آجائیگی۔یہ سنکر بہت خوش ہوئی۔خال نے عنبر کا دانہ آگ پر رکھا اور حسن کی ہمزاد کو اس کے حضور میں حاضر کیا۔حسن یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔گلے ملی

بہت خاطر مدارات کی رات باتوں باتوں میں عقل اور دل کے لشکر کا حال بیان کیا اور اپنے عشق و محبت کا قصہ دھرایا اور کہا کہ دل بیچارا باپ کی وجہ سے جھگڑے میں آپھنسا ہے۔وہ عاشق ہے اسے ان باتوں سے کیا غرض۔یہ مشکل آپڑی ہے۔کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔حسن کی ہمزاد نے سوچ بچار کے بعد کہا۔ترومت۔عقل کی کیا حقیقت ہے۔مہر عشق کا سرلشکر سب پرور تہا۔حسن کی ہمزاد نے اپنا ناز۔غمزہ۔شیوہ۔نخرا اس کی مدد کو بھیجا۔حسن کے پاس بھی ایک باکمال تیرانداز تہا۔جس کا نشانہ کبھی خطا نہوتا۔اس کے کمال کی دور دور شہرت تھی۔اس کا نام ھلال کماندار تہا۔اسے بھی حسن نے سپہ سالار کی کمک پر بھیجا۔جب یہ کماندار پہنچا تو عشق کا پلہ بہت بھاری ہو گیا۔ہلال عقل کے لشکر پر جاپڑا۔چاروں طرف سے اسپر مار پڑی۔وہ ھمت نہ ھارا گھسا چلا گیا۔یکبارگی دل کے پاس جاپہنچا اور انجان بنے سے ایسا تیر جوڑ کر مارا کہ دل کے پار ہو گیا۔مارنا چاھتا تھا کسے اور لگ گیا کسے۔آدمی ہرچند ہوشیاری کرے۔قضا پر بس نہیں چلتا۔عقل نے جب دل کو گھوڑے پر سے گرا دیکھا تو حواس جاتے رہے۔سینہ شق ہو گیا عقل کا لشکر یہ ماجرا دیکھ کر فرار ہو گیا اور کوئی باقی نہ رہا۔عقل بیچارا مارا مارا پھرا۔کہیں ٹھکانا نہ ملا۔کوئی کہتا شہر بدن کو چلا گیا کوئی کہتا مارا گیا۔غرض کچھ پتہ نہ چلا۔

ادھر فتح کے شادیانے بجنے لگے۔سارے شہر میں جشن ہونے لگے۔حسن ہزار ہزار شکر بجا لائی۔عقل کو پاس نہ دیکھ کر دل کو حسن کے خدمتگاروں نے پکڑ لیا اور باندھ کر حسن کے پاس لائے۔حسن کی نظر اس پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل سے آہ نکلی۔بیتاب ہو گئی۔محبت کی آگ سے تن من جل گیا۔مارنے والے کو ہزاروں کوسنے دئیے۔میں نے کب کہا تھا کہ اس کو یوں گھائل کرو۔یہ نمک حرام کچھ سمجھتے نہیں۔جب ذرا دل کو قرار ہوا۔ہوش حواس درست ہوئے تو اپنی دائی کو بلایا جو آفت کا پرکالا تھی۔اس کا نام نازتھا۔اسے اپنی درد بھری داستان سنائی اور صلاح پوچھی کیا کروں۔مجھ سے اب رہا نہیں جاتا۔وہ بھی بیتاب میں بھی بیتاب۔ملنے کی کیا صورت ہو۔ایسا نہو کہ خلق میں رسوائی ہو۔میری رائے میں یہ آتا ہے کہ مہر سپہ سالار کو عشق کے حضور میں بھیجوں اور اس کے ذریعہ سے عقل کے فرار اور اپنی فتح کی خبر سناؤں۔دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ناز دائی نے اس تدبیر اور عقل کی بہت تعریف کی۔غرض مہر نے جاکر فتح کی خبر سنائی۔عشق یہ سنکر عقل پر بہت ہنسا اور کہا کہ یہ بڑا نالایق ہے کہ ایسے جھگڑوں میں پڑتا ہے۔یہ عقل دیوانہ ہے جو عشق سے بھڑنا چاھتا ہے۔اسے عشق اور حسن کے کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر بھاگنا پڑانہ۔اب زلف سے کہو کہ دل کے گلے میں حلقے کا طوق ڈالے اور تاروں کی زنجیروں سے جکڑ کر رکھے۔عقل بہت فتنہ پرداز ہے۔

ناز-غمزے-شیوے-عشوے سے کہنا کہ ذرا هشیار رهیں—

نازدائی نے یہ ساری کیفیت حسن کو آسنائی اور کہا کہ اس معاملے میں جلد، نہیں کرنی چاہئیے-جلدی سے کام خراب ہوتا ہے-اب اس عاشق (دل) کو کسی حکمت سے دوسری جگہ رکھیں اور ملنے کی تدبیر کریں-جلدی میں رسوائی کا ڈر ہے-مناسب یہ ہوگا کہ رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے جو کچھ سونے سے تیار کیا گیا ہے او اس کا سواد بھی بہت سہانا ہے-فی الحال اسمیں بند رکھا جائے-عشق کے راز کو فاش کرنا مصلحت نہیں-دل بیچارا یہاں گرفتار تھا اور اس امید میں تھا کہ شاید میر عشق زور کرے اور حسن کو میرے حال پر رحم آئے-ادھر حسن بیقرار تھی او فراق یار نے انگاروں پر لٹا رکھا تھا-کھانا-پینا-سونا حرام ہو گیا تھا—

سپہ سالار مہر کی ایک بیٹی تھی وفا نام-وہ حسن سے بہت محبت رکھتی تھی اسے بلا کے اپنی بیتابی کا سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ ملنے کی کوئی تدبیر کر-و میرے خیال میں ایک بات آئی ہے کہ شہر میں ایک باغ ہے-باغ کیا ہے اس عالم سنگار ہے-عاشق کی جان ہے-اس میں چشمۂ آبحیات ہے اور باغ کے بیچوں بیچ ایک چھجا ہے-اس چھجے پر غمزے کے بادل چھائے رہتے ہیں اور ناز کے موتی برستے رہتے ہیں-اس چھجے میں بڑی بڑی دو کالی کالی کھڑکیاں ہیں-جو ان دو کھڑکیوں کو کھولے وصل کی لذت پائے-دل کو چوری چھپے اس چھجے پر لانے کی فکر کرنی چاہئیے-حسن نے کہا کیا تو اسے لا سکتی ہے-تجھ میں اتنی قدرت ہے؟ اس نے کہ انشاءاللہ اگر میری عقل میرے ساتھ ہے تو اسے یہاں لا کر پہنچادونگی-اول مجھے یہ بتا وہ ہے کہاں؟ پھر اس سے مل کر اس کے دل کا بھید پاؤنگی اور جہاں تو کہیگی وھاں لاؤنگی-حسن نے زلف کو حکم دیا کہ دل کے پیچ سب کھول دے اور اسے چاہ ذقن سے باھر نکال اور اس کے پاؤں کی گرد اپنے بالوں سے جھاڑ اور دلکشا باغ میں لا پہنچادے-زلف بڑے ناز و انداز سے اکڑتی لچکتی گئی اور دل کو چاہ ذقن سے نکال باھر لائی-اتنے میں وفا بھی آپہنچی-دل سے گھل مل کے باتیں کرنے لگی-بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا کہ حسن نے جو تجھے بند رکھا تھا اس میں مجبوری تھی-باپ کا ڈر اور لحاظ تھا-اگر ایسا نکرتی تو تیری جان کے لالے پڑ جاتے-حسن نے تیرے ساتھ بڑی مروت و عنایت کی-تجھے اس کی قدر کرنی چاہئیے-مرد بڑے بے وفا او بے مہر ہوتے ہیں-عورت کی محبت کی قدر نہیں کرتے-عورت بیچاری بھولی بھالی ان کے داؤں میں آجاتی ہے-غرض اس طرح کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے دل کو موہ لیا اور محبت کی گرمائی سے گرمایا-کنوئیں سے نکل کر باغ میں آیا تو بہت خوش ہوا-بہت دنوں کا تھکا ماندہ تھا-وھیں پھولوں کی کیاری پر پڑ کے سو رہا وفا نے جاکر حسن کو خبر دی کہ دل کی آنکھ لگ گئی ہے-اب تیری مراد بر آئی

یہ سنکر حسن مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی-ھوا کی طرح اڑ کے آئی-دیکھا کہ دل کا قرار-جی کا آرام دل پڑا سو رھاھے-سر ھانے ھاتھہ رکھے پھولوں پر آرام کر رھاھے-اور سارے باغ میں اس کے حسن کی جوت ھے-معلوم ھوتاھے گویا چودھویں رات کا چاند اتر آیاھے-دل کی صورت دیکھہ کر حسن کا دل ھاتھہ سے جاتا رھا-اس کے پاؤں پر آنکھیں ملیں-بلائیں لیں اور اس کا سراپنی گود میں لے کے بیٹھہ گئی-مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رھے تھے-چند قطرے دل کے رخسار پر گرے تو اس کی آنکھہ کھل گئی-حیران تھا کہ باغ میں دفعتاً بہار کہاں سے آگئی اور یہ سہانا پن کیونکر پیدا ھو گیا کہ سارا چمن نور کا عالم ھے-آنکھہ اٹھا کے دیکھا تو دوسرا ھی عالم نظر آیا-دل سے آہ نکلی-بے قرار ھوگیا-محبت کے جوش میں دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور پھر بھینچ بھینچ کے گلے ملا-اب گلے شکوے اور راز و نیاز کی باتیں ھونے لگیں-اس کے بعد حسن نے کہا کہ تیرے عشق نے بیتاب کر دیا اور یہاں کھینچ لایا-جان سے ھاتھہ دھو کر یہاں آئی ھوں-اب اجازت دے-جاتی ھوں-وصال کی تدبیر کرتی ھوں یا تجھے بلا بھیجتی ھوں یا خود تجھے لینے آؤنگی برا نہ مان اور میری مصلحت کو پہچان—

وفا اور ناز نے چھجے پر کی مجلس آراستہ کی-نظر اور خیال اور تبسم اس باغ کے پانی کے چشمے پر صحبت رکھتے تھے-حسن بیتاب اور بے صبر ھو کر پہنچی اور وفا کو الگ بلا کر منت کرنے لگی کہ خیال-نظر اور تبسم سے کہو کہ دل کا دل ھاتھہ میں لیں اور اسے داروے بیہوشی پلائیں اور زلف سے کہو کہ دل کو اس چھجے پر اس طرح لیکر آئے کہ اسے بھی خبر نہ ھو-اپنے کو جانے نہ دوسرے کو پہچانے خیال اور نظر اور تبسم نے حکم کی تعمیل کی-داروے بیہوشی سے دل کو بے خبر اور بے سدہ کیا اور زلف اسے چھجے پر اس طرح اٹھا لائی کہ دل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ھوئی-وہ یہی سمجھہ رھا ھے کہ جہاں تھا وھیں ھوں-اب کیا تھا حسن کی خوشی اور مسرت کی کوئی حد نہ رھی-خوب گھل مل کے باتیں کیں اور اپنے ارمان نکالے-غرض اس طرح روز حسن دل کو بالا خانے پر لاتی اور مزے اڑاتی—

آخر یہ چوری کب تک چھپتی-رقیب روسیاہ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا جو حسن کے پاس رھتی تھی-ظاھر میں دوست تھی پر دل میں اس کے کھوٹ تھا-اسے اس کا جلاپا تھا کہ حسن اکیلے اکیلے جاتی ھے مجھے ساتھہ نہیں لے جاتی-اس لئے اس کے درپے ھوگئی کہ دیکھوں میرے ھاتھہ سے کیونکر بچتی ھے-ایک رات جب حسن دل سے ملنے گئی تو یہ چوری چھپے سے اس کے ساتھہ ھولی اور بالا خانے پر ایک کونے میں چھپ کے بیٹھہ رھی اور ان کے راز سے واقف ھوگئی-دل کو دیکھہ کر وہ بھی اس پر ریجھہ گئی اور کہنے لگی میں کیا حسن و جمال میں حسن سے کم ھوں-میں بھی دلربا اور محبوب ھوں-ناز و غمزہ میں اس سے کم نہیں-میں

دل موهنا جانتی هوں-میں بھی انداز دلربائی کی گھاتوں سے واقف هوں—

ایک شب حسن شہر گئی تو کسی وجه سے اس کا آنا نه هوا-موقع پاکر وصال کے بالا خانے پر چڑھ گئی-جادو ٹونے میں کمال رکھتی تھی-حسن کی صورت بنا کر بیٹھ گئی-خیال اور نظر اور تبسم اور وفا کو جس طرح حسن حکم دیتی تھی اسی طرح اس نے بھی حکم دیا-چنانچه دل کو داروے بیهوشی پلا یا گیا اور زلف اسے جوں توں وصال کے بالاخانے پر لائی-اتنے میں خیال جو سورها تھا جاگا دل کو دیکھا تو کہیں نه پایا بہت پریشان هوا-ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وصال کے بالاخانے پر پہنچا تو دیکھا که غیر دل کی گود میں مست پڑی هے اور دل بے خبری کے عالم میں هے-خیال فوراً شہر دیدار کو گیا اور گلزار میں جاکر جو کچھ دیکھا تھا حسن سے بیان کیا-یه سن کر حسن کے هوش جاتے رهے-تن بدن میں آگ لگ گئی-جیسے بیٹھی تھی اٹھ کھڑی هوئی اور حسد کی آگ میں جلتی بھنتی وصال کے بالاخانے پر آئی-غیر اور دل کو ایک جگه دیکھ کر آپے سے باهر هوگئی اور لگی غیر کو کوسنے اور گالیاں سنانے اور ایک قیامت برپا کردی-غیر هکا بکا رہ گئی-جادو کے زور سے بھیس بدل حسن کی نظروں سے چھپ گئی اور وصال کے بالاخانے سے اتر نیچے آئی اور شہر سبکسار کی طرف روانه هوئی-حسن دل پر بھی سخت برافروخته هوئی اور اس کی بے وفائی اور بے مہری سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے هوگیا اور طیش میں آکر خیال-نظر اور تبسم کو حکم دیا که اس نالائق-بے وفا-مردکھ کو باغ سے باهر نکال دو-وہ عورت کم عقل-احمق تھی-یه مرد تھا یه کیوں پھسل پڑا-میں اس کی خاطر سارے عالم میں بدنام هوئی اور یه ایسا بے وفا نکلا—

غیر نے ادھر تو حسن اور دل سے یه فریب کیا اور ادھر اپنے باپ رقیب سے جا لگائی-وہ یه ماجرا سن کر بہت برافروخته هوا اور شہر دیدار میں آیا اور دل کی تلاش شروع کی-آخر اسے حسن کے بندی خانے میں پایا-جادو اور ٹونے میں کمال رکھتا تھا-خیال اور نظر اور تبسم پر کچھ دانے پڑھ کر پھینکے-یه تینوں دیوانے هوگئے اور دل کو بندی خانے سے نکال شہر سبکسار کو لے گیا-وهاں ایک کوٹ هجر نام کا تھا-اس میں قید کر دیا-یہاں بیچارہ دل اتنا پریشان هوا که جینے سے بیزار هو گیا اور اپنے کئے پر بہت پچتایا اور اپنے حال پر بہت تاسف کیا-تمام حالات سے بے خبر جی هی جی میں کہتا تھا که مجھسے کون ایسا قصور هوا تھا که حسن نے یه ستم مجھ پر ڈھایا-آخر مجھسے پوچھنا تو تھا که میں نے کیا خطا کی-یه کیا انصاف هے که دوسرے کے کہنے سننے سے مجھے زندہ درگور کر دیا-میں نے برا کیا جو ایسی جگه دل لگایا-عورت بھی عجیب بلا هے-خدا اس سے پناہ میں رکھے-غرض ان باتوں پر غور کرتا اور دل هی دل میں کڑھتا—

حسن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ الگ بیتاب اور مضطر ہوئی-آخر میں بھی دل کے حال پر ترس آیا اور اس نے حسن کو ایک رقعہ لکھا کہ تو جس قدر مجھ پر غصہ کرے بجا ہے-اصل میں میری خطا ہے-دل بیچارہ بے گناہ ہے-میرا دل اس پر آیا اور میں تیری صورت بنا کر اس سے ملی-اسے کیا خبر تھی کہ یہ دغا بازی ہے-بے خبر اور مست پر پاداش لازم نہیں-وہ عاشق صادق ہے اس پر غصہ درست نہیں میں تیری بھی قصوروار ہوں اور دل کی بھی-یہ فراق میرا ڈالا ہوا ہے-تو اپنی مروت سے معاف کر۔(وغیرہ وغیرہ) اس رقعے کا مضمون پڑھ کر حسن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ہوش و حواس جاتے رہے-بال نوچنے لگی اور سینہ کوٹنے لگی اور اپنے فعل پر بہت نادم ہوئی-اسی وقت دل کو اشتیاق بھرا خط لکھا جس میں اپنے فراق اور غیر کی شکایت لکھی اور ہزاروں قسمیں دیکر اپنی بے گناہی کا یقین دلایا-خیال کے ہاتھ یہ رقعہ دل کو بھیجا-جب یہ نامۂ شوق دل کو پہنچا تو وہ بھی بیتاب ہوگیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے-غیر کو بہت برا بھلا کہا کہ یہ سارا فساد اس حرام خور کا ہے-حسن اس میں بے قصور ہے-اس کے جواب میں رقعہ لکھا کہ اس میں تیرا قصور نہیں-قصور سراسر میرا ہے-یہ سارا بیج بویا ہوا غیر کا ہے-میرا دل تجھ سے صاف ہے-وہی محبت وہی چاہ ہے-اگر تو مجھے داروے بیہوشی نہ پلایا کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا-خیر جو ہوا سو ہوا—

اب دوسری طرف کا حال سنئے کہ عقل بادشاہ شکست کھا کر شہر بدن (تن) میں آیا-مارے شرم کے کہیں چھپ رہا اور صبر جو عقل کا سر لشکر تھا وہ عشق کے لشکر سے بھاگ کر شہر ہدایت میں آیا اور ہمت سے کہا کہ دل زخمی ہوکر حسن کے ہاتھ گرفتار ہوا اور عقل شکست کھا کر نہ معلوم کہاں غائب ہوگیا ہے-یہ قسمت کا لکھا تھا جو ہوا-ہمت نے بہت رنج و افسوس کیا اور کہا کہ عقل کا مجھ پر بہت حق ہے-شرط دوستداری یہ ہے کہ اب عقل اور دل کی خبر لوں اور انہیں تسلی دوں-نہ معلوم ان بد نصیبوں کا کیا حال ہے اور ان پر کیا گزر رہی ہے-اس وقت یاری اور دستگیری کا وقت ہے-ہمت نے یہ کہہ کر تلوار ہاتھ میں لی اور اپنا لشکر مستعد کیا اور شہر دیدار کی طرف روانہ ہوا-رستے میں جہاں جہاں پہنچتا عقل اور دل کا حال پوچھتا جاتا-چلتے چلتے قامت کے بوستان میں آیا-بھائی سے عقل اور دل کا احوال پوچھا-قامت نے کہا اے ہمت تونے خوب کیا تجھ پر ہزار رحمت-سچے اور وفادار آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں-آج ایک سال ہوتا ہے کہ دل ہجراں کے کوٹ میں پڑا ہے اور عقل شہر تن کو گیا ہے-عشق کا لشکر بے شمار ہے-اس سے جیتنا مشکل ہے-اس سے مل کے رہنے ہی میں مصلحت ہے-اس سے لڑنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ خود خراب-گھر خراب-ملک خراب اور رعایا الگ پریشان-اب صرف ایک تدبیر ہے

ی دو سمجھا بجھا کر کسی طرح منانا چاہئے-عشق بہت بڑا بادشاہ ہے-اگر اس سے التجا کی گئی تو وہ ضرور مان جائیگا-یہ یاد رکھو کہ بغیر اس سے صلح کئے گزیر نہیں-قامت کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اسی وقت اپنا لاؤ لشکر چھوڑ عشق کی خدمت میں پہنچا-اس کی بہت مدح و ستایش کی-عشق نے بھی اس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور عزت سے اپنے پاس بٹھایا-ہمت نے پہلے اِدھر ادھر کی باتیں کیں پھر موقع سے عقل اور دل کا ذکر چھیڑا اور ان کی طرف سے ایسی نیابت کی کہ عسق راضی ہوگیا اور یہ قرار پایا کہ دل عشق بادشاہ کی وزارت قبول کرے عشق کے بعد سب سے بڑا رتبہ اسی کا ہوگا-عشق بادشاہ اور دل وزیر ہوا تو کام خاطر خواہ چلے گا—

اس کے بعد عشق نے اپنے سر لشکر مہر کو حکم دیا کہ شہر بدن (تن) کو جائے-عقل کو تسلی اور دلاسا دے اور عزت و حرمت سے یہاں لائے-غرض مہر جس قدر جلد ہوسکا شہر بدن پہنچا اور عقل سے ملاقات کی-عشق نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف بیان کیا اور سب اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ کسی طرح کی فکر نہ کر-تیرے اقبال نے زور کیا ہے وہاں جانے کے بعد سب خرخشے دور ہوجائیں گے اور تو امن و آسائش اور بلند اقبالی کے ساتھ رہے گا-عقل نے یہ سمجھ کر کہ اب حکومت و دولت سب جاچکی ہے-یار-دوست-مشیر اور مصاحب سب نے منہ پھیر لیا ہے مصلحت یہی ہے کہ عشق کی بات مان لی جائے کیونکہ اب عشق سے صلح بغیر کوئی صورت نہیں-غرض اس نے عشق کا فرمانا قبول کیا اور مہر کے ساتھ عشق کے حضور میں پہنچا-دست بوسی کی اور دعائیں دیں-عشق عقل سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسے گلے لگایا اور ہر طرح خاطر جمع کی اور کہا کہ میں بادشاہ اور تو وزیر-ملک اور حکومت تیرے سپرد ہے-مجھ سے ملک داری کی سردردی نہیں ہوسکتی جو تو مناسب سمجھے سو کر—

غرض جب عقل عشق بادشاہ کا وزیر مقرر ہوگیا تو عشق نے ہمت سے کہا کہ دل کو ہجران کے کوٹ سے نکال کر میرے سامنے حاضر کر-اور اس کے پاؤں کی بیڑی نکال کر رقیب کے پاؤں میں ڈال اور غیر کو جو اسکی بیٹی ہے ایسی جگہ قید کر کہ وہاں سے نکل نہ سکے-ہمت سلام کر کے روانہ ہوا-اور دل کو ہجران کے کوٹ سے لڑ جھگڑ کر باہر لایا-اس کی بیڑیاں رقیب کے پاؤں میں ڈالیں اور غیر کو بھی ایک مکان میں بند کر دیا-اگرچہ اس پر اس کا دل دکھا مگر حکم کی تعمیل واجب تھی-غیر نے جیسا کیا تھا ویسا پایا-اس کے بعد ہمت دل کو عشق کے پاس لایا اور عشق کو دل سے ملایا-سب ایک دوسرے کے گلے ملے-آخر عقل اور عشق نے باہم مشورہ کر کے یہ ٹھیرایا کہ حسن کا عشق سے عقد کردیا جائے-غرض بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی-اور دونوں

کی مراد برآئی-گھر گھر عیش وعشرت کا سماں تھا اور خوشی کے شادیانے بج رہے تھے—
ایک روز دل اور ھمت اور نظر تینوں شراب پئے رخسار کے گلزار میں آئے-
وھاں آب حیات کا چشمہ دیکھا-عاشقوں کو چشمہ بہت بھایا اور کہا کہ اگر یہ آب حیات پی لیا تو عاشق اگر ھزار بار مریگا تو ھزار بار جئیے گا-ھمت نے کہاکہ اے دل اس پیر روشن ضمیر کی قدمبوسی کر-یہ حضرت خضرھیں-دل نے دوڑ کر خضر کے قدم لئے-ادب سے الگ بیٹھا-اور اس بزرگ کی دعالی-دل کے دل میں راز کا خیال آیا-خضر نے بھی آنکھہ سے وھی اشارہ کیا-دل اور آنکھوں سے باتیں ھوئیں مگر وہ بات انھیں دونوں میں رھی-خضر کے فیض سے دل اپنی مراد کو پھنچا-دل اور حسن رھے سھے-پھولے پھلے-بال بچوں والے ھوئے-ان کا سب سے بڑا فرزند یہ کتاب ھے جو اپنے وقت کا افلاطون و لقمان ھے-روشن ضمیر اور صاحب تدبیر ھے-سب اس کی صحبت سے خوش-ھر ایک اس کی باتوں سے شادکام-جو کوئی صاحب نظر ھوگا اسے یہ سخن بھائے گا اور قدر کریگا—

سارا قصہ اتنا ھے جسے مینے کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا ھے-گو اس میں عام قصوں کی سی دلچسپی نہو مگر انسانی جذبات کی حقیقت اور کش مکش کو فسانے کی صورت میں مصنف نے جس طرح بیان کیا ھے اس میں ایک لطف ضرور پیدا ھوگیاھے نام بھی حالات و واقعات کے لحاظ سے بہت موزوں رکھے ھیں-اگرچہ کہیں کہیں وہ بھولے سے تن کی جگہ بدن اور لٹ کی جگہ زلف-یعنے مترادف الفاظ لکھہ جاتے ھیں لیکن افسوس یہ ھے کہ جگہ جگہ پند ر نصائح کا دفتر کھول دیا ھے جس سے قصے کی دلچسپی کم ھوجاتی ھے-اور بعض مقامات پر یہ پندو نصیحت بہت بے موقع معلوم ھوتی ھے-مثلاً پہلی دفعہ جب دل اور حسن کی ملاقات باغ میں ھوتی ھے اور وہ آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ھیں تو وھاں خداکی وحدانیت اور تصوف و فقر کا بیان بالکل بے موقع ھے-یا وصل کی شب عشق کا فلسفہ اور عشق کی قسموں پر بحث بے محل معلوم ھوتی ھے-اسی قسم کی بے موقع بحثوں اور مواعظ سے پڑھنے والے کی طبیعت کو الجھن پیدا ھوتی ھے اور قصے کا لطف جاتا رھتا ھے-اس میں شک نہیں کہ مصنف نے جس خیال پر اس قصے کی بنیاد رکھی ھے وہ بہت خوب ھے اور اس میں ایک قسم کی جدت پائی جاتی ھے-عقل اور عشق اور دل اور حسن کی لڑائی عالم گیر ھے-اور جیسا کہ مصنف نے ظاھر کیا ھے عشق ھمیشہ جیتتا اور عقل ھمیشہ ھارتی ھے-حسن غالب اور دل مغلوب رھتا ھے-اگرچہ ان مین ھمیشہ جنگ رھتی ھے لیکن در حقیقت یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں-بلکہ یہ جدو جھد ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی ھے اور یہ وہ کشش ھے جو سارے عالم پر چھائی ھوئی ھے-اور اسی کی برکت ھے کہ انسان کی زندگی میں ایسی دلکشی پیدا ھوگئی ھے کہ اسے

جان اس قدر عزیز ہے اور اس دکھیا بستی کو چھوڑنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔دراصل مصنف کا مقصد اس کتاب سے نصیحت کرنا ہے جسے اس نے قصے کے پیرائے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن قصے اور نصیحت کے ملا دینے سے نہ قصہ قصہ رہتا ہے۔ اور نہ نصیحت نصیحت۔کیا اچھا ہوتا کہ وہ اسے اس طرح بیان کرتا کہ پڑھ کر دل پر چوٹ لگتی۔خیال مزہ لیتا۔دماغ اثر پزیر ہوتا۔یہ نصیحت و وعظ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کھلی نصیحت بہت کم کارگر ہوتی ہے۔قصے کا راز اسی میں پنہاں ہے—

مصنف نے یہ قصہ پرانے بادشاہوں کے قصوں کی طرح بیان کیا ہے۔وہی دربار ہے وہی جنگ وجدل ہے اور ویسے ہی مصاحب اور مشیر ہیں۔وہی کوہ قاف کی پری اور جادو کا اثر ہے۔لیکن بڑی خوبی یہ ہے کہ فضول اور بے سر و پا باتیں اس میں مطلق نہیں۔غیر مہذب اور فحش باتوں سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ نصیحت و وعظ سے تو وہ کہیں نہیں چوکتا۔لیکن ایسی صاف اور پاکیزہ زبان میں ادا کرتا ہے کہ کتاب کا مقبول ہونا یقینی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مصنف کے زمانے میں یہ کتاب ضرور مقبول ہوئی ہوگی اور لوگ اسے پند و موعظت کی کتاب سمجھ کر پڑھتے ہونگے اور اس تصنیف سے یہی اس کا اصل مقصد تھا۔طرز بیان بھی اس کا بہت سادہ ہے۔اگرچہ مقفی ہے اور اس میں تکلف کرنا پڑتا ہے مگر عام لوگ اسے نئی چیز سمجھ کر ضرور شوق سے پڑھتے ہونگے۔نثر میں قافیہ کا التزام اگرچہ بھونڈی بات ہے اور خلاف عادت ہے لیکن اس میں ایک دلکشی بھی ہے۔ نظم کا بھی کہیں کہیں چٹخارا ہے اور بعض مقامات پر اپنی طبعزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو نظم و نثر دونوں پر قدرت ہے۔خود وجہی کو بھی اپنی اس تصنیف پر ناز ہے اور کہتا ہے کہ اس فصاحت اور لطافت سے کسی نے آج تک ایسی کتاب نہیں لکھی۔یہ میری ایجاد ہے اور جو اس رستے پر چلے گا وہ میرا مقلد ہوگا۔مثلاً کہتا ہے "فرہاد ہو کر دو جہاں سے آزاد ہو کر۔دانش کے تیشے سوں پہتراں الٹایا تو یو شیریں پایا۔تو یو نوی بات پیدا ہوئی تو اس بات آیا.........دانا ھنا رھنما کر جانیگا۔ھادي ھے کر پہچانیگا.........جیتے گنکار کرتے گن اس باغ میں تھے لینگے پھول چن۔جس کے دماغ میں اس پھول کی باس جاویگی تازي ارواح تن میں آویگی۔جو کوئی اول اچھا یا بنیاد۔اول آخر رھی استاد......... یہاں خدا بھی بولنہار اچھ ہے۔جو کوئی ھماری بات چلیا وو ھمار اچھ ہے۔ھر چند فہمداری ہے چلیا تو کیا ھوا بات ھماري ہے" اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ کتاب عجیب اور بے نظیر ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے—

اب میں اس کتاب کے بعض مقامات بطور نمونے کے پیش کرتا ہوں جس سے اس

کی عبارت کا ڈھنگ اور اس وقت کی زبان کی کیفیت معلوم ہوگی—

کتاب حمد سے اس طرح شروع کی گئی ہے:—

"تمام مصحف کا معنی الحمداللہ میں ہے مستقیم-ہوا تمام الحمداللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم-ہوا تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم-سمجھہ دیکھہ خاطر لیا اتال-حدیث بھی یوں ہے کہ العلم نقطة و کثرھا جہالٌ- یعنے علم ایک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڈھاے-جہالت کو اس حد لگن لگائے-ہور فارسی کے دانشمنداں-جنوں سمجتے ہیں باتاں کے بنداں-انوکوں یوں بھایا ہے-انو میں بھی یوں آیا ہے کہ اگر در خانہ کس است-یک حرف بس است-ہور گوالیر کے چاتراں گن کے گراں-اینوں بھی باتکوں کھولے ہیں-یوں بولے ہیں (فرد) پوتی تھی سو کھوتی بھئی پنڈت بھیا نکوے-ایک ہی اچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوے-قدرت کا دھنی سہی-جو کرتا سو سب وہی-خدا بڑا خدا کی صفت کرے کوئی کتیک-وحدہ لا شریک-ماں نہ باپ-اپیں آپ-پروردگار-سینسار کا سرجنہار-جتی جکوی قدرت دھرتا ہے-صفت اس کی اپنے پرتے کرتا ہے-وو بیحد اس کی صفت کوں کاں حد- احد صمد لم یلد ولم یلد (بیت) کسے ہے حد جو خدا کی صفت کی حد پاوے-ہر ایک بال کوں گر سو ہزار جیب آوے-جس کا ناؤں خدا ہے-وو سب سوں ملیا ہور سب سوں جدا ہے-کوئی کیوں اسے کہے! کہ یوں ہے-خدا ہے جوں کہیں کہ تیوں ہے-کون سمج سکتا خدا کی گت-ایک اپے لا کہ صفت-ہزاروں اور ایک اس کا ناؤں-اس کی معرفت تہاویں تہاؤں (بیت) جہاں جکچہ ہے وہاں سب اہے ظہور اس کا-ہر ایک شے منے دیتا ہے جلوہ نور اس کا-خدا قادر-خدا حاضر-خدا ناظر خدا سکتا-جے جیوں منگتا اسے ووں رکھتا-سات زمین سات آسمان میں اس کا کھیل-جو کچھہ وہ کرے سو ہوے اس حکم کوں کون سکے تھیل-اپیں آپ جل جلال-دم مارنے یہاں کسے نیں مجال-(بیت) اس تہار پر کسے ہے نظر جو نظر سٹے-گر جبرئیل ہوئے تو بھی یہاں بال و پر سٹے"—

نعت و منقبت:—

"عشق خدا کوں بھیدیا تو اس کی خاطر آسمان زمیں ہویدا کیا-عشق خدا کوں بھیدیا تو اپنا جیب کر محمد کوں پیدا کیا-اگر محمد نا ہوتا تو آسمان زمیں نا ہوتا-اگر محمد نا ہوتا تو ماہ و پرویں نا ہوتا-اگر محمد نا ہوتا تو دنیا ہور دین نا ہوتا-صاحب طہ و یسن-صاحب الارحمة العالمین-جس کے نور نے عالم نے پایا روشنی-لولاک لما خلقت الافلاک کا دھنی-اول خدا ہے نبی دویم سویم ہے ولی-یو تین ناؤ تھے مومن کے دل کوں تجلی-محمد کو جس رات ہوئی معراج-وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج-گیان دھیان کے کام تمام محمد نے لیا یا جو کچھہ پانا تھا سو

محمد نے پایا-جو کچھہ محمد نے پایا سو علی کوں سمجایا-یو سمج علی کی تقسیم آیا-
علی خدا کوں بھایا-رسول کوں بھایا-محمد نبی-علی و لی-نبوت خدا کی پیشوائی-
ولایت محبوبی ہور استغنائی-نبوت کارسازی-ولایت بے نیازی-ولایت ھار گلے
یار کا-نبوت دھندا گھردار کا-ولایت آکر نبوت آتی-نبوت آئی تو کیا ولایت جاتی-
فرق دھندے کا تک میانے آتا-کسے کچھہ سپڑتا کوئی کچھہ پاتا-حضرت کہیں خدا شاھد-
انا و علی من نور واحد-تن سوں تن جیو سوں جیو دم سوں دم-نبوت محمد پر
ولایت علی پر ختم-ابابکر عمر ہور عثمان-جنوں کی نیکی جانتا سب جہاں-حضرت کے
یاراں ھیں بزرگواراں ھیں-اکستی ایک سب بھلے-جوں خدا رسول فرمایا تیوں چلے-
لات نہیں کئے-خلاف نہیں کئے-حق پر چلنہارے ایسیچہ اچھتے ھیں-خدا کے پیارے
ایسیچہ اچھتے ھیں-حضرت کے یار جنو سوں کرتے تھے بچار-آخر بعد از حضرت کے بیتھے
حضرت کی ٹھار (بیت) ھر ایک حال خدا کوں یقین سوں جپنا-ولایت ہور نبوت یو
قرب ھے اپنا-ولایت کی جاگا پر نبوت کی جا صدر-ایکستی ایک خوب ایکستی ایک
خوبتر-خدا بہوت بڑا-سب ٹھار حاضر سب ٹھار کھڑا-سب میں اپنا نور بھریا-کسی
کچھہ کسی کچھہ کسی سب کچھہ کریا"

سبب تالیف کتاب و مدح بادشاہ:—

"سلطان عبداللہ-ظل اللہ-عالم پناہ-صاحب سپاہ-حقیقت آگاہ-دشمن پرور-
ثانی سکندر-عاشق صاحب نظر-دل کے خطرے تے باخبر-صورت میں یوسف تے اگلے-
آدم بیہوش ھو پتھر پگلے-حکمت میں افلاطوں شاگرد-سخاوت میں کھولے حاتم کا
برد-شجاعت میں رستم گرد-عالی ھمت غازی مرد-شمشیر ہور ھمت کے صاحب-
نیم دھرم اور ست کے صاحب-دارا در-فریدوں فر-کلیم بیان-مسیحا دم-مریخ
صولت-زھرہ عشرت خورشید علم-صبا* کے وقت-بیٹھے تخت-یکایک غیب تے رمز پاکر
دل میں اپنے کچھہ لیا کر-وجہی نادر منکوں-دریا دل گوھر سخنکوں-حضور بلائے-
پان دئے-بہت مان دئے ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بچہ میں کچھہ عشق کا بیان
کرنا-اپنا نائوں عیاں کرنا-کچھہ نشان دھرنا-وجہی بھوگنی گن بھریا-تسلیم کر کر
سر پر ھات دھریا-بہوت بڑا کام اندیشیا-بہت بڑی فکر کریا-بلند ھمتی کے بادل تے
دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا-قدرت کے اسراراں برسایا-بادشاہ فرمائے
پر چنتیا-نزی تقطیع بیٹیا کہ آنگے کے آنہارے-ھمیں بھی کچھہ تھے کر سمجیں بارے-
ھمارے گن کوئی دیکھے سو ھمنا دیکھے-گنگا دیکھے سو جمنا دیکھے-ھمنا تے بھی آنگے تھے
سو انو کا کچھہ تمیز کریں-ریاضت مشقت ھماری چیز کریں-عاشق کو عاشق جانتا-

---

*صباح

عاشق کو عاشق پہچانتا (بیت) کند هم جنس باهم جنس پرواز-کبوتر با کبوتر باز با باز-
مورک آسودے دیوانے-نیں جلے بات* کیا جانے-جیوں تیوں اس دنیا میں کچھ
یاد گار اچھے تو خوب هے-یو جهاز هے اس جهاز کوں بار اچھے تو خوت هے-اس دنیا میں
رهیگی سو بات هے-باقی وو دیس کا یو سو رات هے-جنے کچھ سمجا سمجیا عاقبت
لگن-انے اپنی جاگا رکھیا اپنا گن-استے نهیں رها گیا-کچھ کها گیا-که شاید کدهیں
کوئی عاشق پڑھے تک تلملے تک چر پھرے-تک مستی چھرے تک تر پھرے-هور سمجے
که ان عاشق کامل نے کیا بولیا هے-کس کس جاگا پر کیسے کیسے بهیداں کھولیا هے-هم
گلاب ابلوج گھولیا هے-هم مانک موتی رولیا هے-داد دیوے-مراد دیوے-کسے کچھ
سنپڑے کسے کچھ انپڑے..........................''—

در زینت سخن و تسمیۂ کتاب:—

'' یو قدرت الله هے-یو اسرار الله هے-یو هاتف الله هے-لااله الاالله-یه عجب
کتاب هےسبحان الله-اس کتاب کا ناؤں سب رس-سبکوں پڑنے آوے هوس-بول بول
کوں چڑھے امس-یاد گار هو اچھے گا دنیاں میں کئی لاک برس-بهوتیچھه شیریں
بهو تیچھه لذیذ-عاشقاں کے گلے کا تعویذ-یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج-سب
باتاں کا راج-هر بات میں سو سو معراج-اس کا سواد سمجے نا کوئی عاشق
باج-اس کتاب کا لذت پانے عالم سب محتاج-کیاعورت کیا مرد-جس مین کچھ عشق کا
درد-اس کتاب کو سینے پرتے هلاسی نا-اس کتاب بغیر اپنا وقت بھلاسی نا-جو کوئی
پڑیگا-جنس جنس کا اثر چھریگا-جو کوئی اس کتاب کا سمجے گا معنا-کیا حاجت هے
اسے کیف کھانا-یو کتاب عاشقاں کا جیو صاحب-معشوقاں کا یار مصاحب-یو رنگ رنگ
پھول سرنگ مقبول-سب کسی بھاتے-یو پھول دایم تازے هرگز نهیں کھلاتے-ایسے
خوش باس کے پھولاں اجھوں کسی باغ نیں کھلے-ایسے پھولاں اجھون کسی نین ملے-
سنگتے دل میں بھرے اساس-کهاں هے وه پھول جس پھول میں ایسی باس-جو کوئی
یو کلام سنے گا پڑیگا-هور فاتحه نا پڑیگا-تو وو بے خبر خام هے-اس کی دانش پر
اس باب کا لذت حرام هے-کیا واسطه که یو بات نهیں یو تمام وحی هے الهام هے-جسے
خدا کی محبت سوں غرض هے-اس پر فاتحه همارا فرض هے-اگر ممات هے تو ادھر
کی سعادتی کا-واگر حیات هے تو ادھر کی سلامتی کا-اگر کسی میں سخن شناسی
هور اسرار دانی هے-تو یه کتاب گنج العرش بحرالمعانی هے-جیتا کوئی طبعیت کے
کواڑ کھولیگا-اس کتاب میں نهیں سو بات کیا بولیگا-جو کچھ اسمان هور زمین
میں هے-سو اس کتاب میں هے-جو کچھ دنیا هور دین میں هے-سو اس کتاب میں

---

* بات

ھے-ھرگز کوئی فصیح اس فصاحت کوں اس نہایت سوں نہیں کیا-اس دھات بات کوں سلاست نہیں دیا-ھر ایک بشر کا کام نہیں-ھر ایک بیخبر کا کام نہیں-اس کتاب کو وو سمجیگا جو کوئی صاحب راز ھے-یو کتاب تمام اعجاز ھے-اگر دین ھور دنیا کا امید پانے منگتا ھے تو یو کتاب دیکھہ-اگر بڑا ھو کر عالم کو سمجانے منگتا ھے تو یو کتاب دیکھہ-مسلمانان میں پیر و مرشد ھویگا-ھندواں میں جنگم سد ھویگا-ھم ھندو تجتے بات پاتجے مانیگے-ھم مسلمان تجے بڑا ھیکر جانیگے-ایک کلمے کا فرق ھے-باقی خدا کی وحدانیت میں ھندو مسلمان غرق ھے............خدا حق ھے ھور حق سب تھار ھے-آدمی کی جنس کو حق پراتے کیا بار ھے—

جیتے چوساراں جیتے فہمداراں-جیتے گن کاراں-ھوے سن-آج لگن-کوئی اس جہان میں-ھندوستان میں-ھندی زبان سوں-اس لطافت اس چھنداں سوں-نظم ھور نثر ملا کر گلاکر یوں نہیں بولیا-اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نہیں گھولیا-یوں غیب کا غلم نہیں کھولیا-خضر کے مقام کو انپڑنا-تو اس بات میں پڑنا-میں تو یو بات نہیں کیا ھوں-عیسیٰ ھو کر بات کوں جیو دیا ھوں-دانش کے باغ میں آیا-بہار ھو کر پھولاں کھلایا-اگر کوئی ھوڑ کوڑ جہالت سوں-بد اصالت سوں رزالت سوں-بات کرے نا-سمجھ یو مایا-یو خدا بھی اس جاگا حضرت جیسے کون کہیا ھے کہ کوڑاں-میں مجہول نامعقول-مردود نا مقبول سن یا رسول..........

غرض بہت نادر نادر باتاں بولیا ھوں-دریا ھوکر موتیاں رولیاں ھوں-موتیاں کی موجاں کا میں دریا ھوں-تمام موتیاں سوں بھریا ھوں-اس دریا میں غوطے کھانے کے تو جاگا جاگا کے غواصاں موتیاں پانے کے-یو کتاب عجائب ایک بندر ھے-اگر سورج منگتا وگر چندر ھے-فرھاد ھوکر دو جہاں تھے آزاد ھوکر دانش کے تیشے سوں پتھراں (پہاڑاں) الثایا تو یہ شیریں پایا-تو یو نوی بات پیدا ھوی تو اس بات آیا-نادان ایتی باتاں میں یو بی ایک بات کر جانے-وے یو بات کیوں کاڑی کس وزاں* سوں نکلی محنت نہیں سمجے مشقت نہیں پہچانے-انو کوں نہیں کتے زباں آور-یو بولتے جناور............کام بہوت خاص کیا ھوں-چلتی عمارت راست کیا ھوں-یو غیب کی بشارت-جسے عمارت کتے سو یو عمارت-ماٹی پھتر کی عمارت سدا رھتی نہیں-رہ بیوفا کچہ اس میں وفاداری نہیں-دنیا دو دیس کا-کوں کسکا-آخر رھیگا سو یو چہ قدر جاننا اس کا-مال دھن سب خرچا جاویگا-آخر یو چہ کام آویگا-آخر نام یوچہ اچاویگا-یو خدا کی عنایت-یاں کیا شکایت-خدا بہوت بڑا بے نہایت"—

* وضع

قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے—

"آغاز داستان۔ زبان ہندوستان۔نقل۔ایک شہر تھا۔اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل۔دین و دنیا کا کام استے چلتا۔اس کے حکم باج ذرا کیں نہیں ہلتا۔اس فرمائے جنو چلے۔ہر دو جہاں میں ہوے بھلے۔دنیا میں خوب گنوائی۔چار لوکان میں عزت پائی۔جاں رہے کھڑے۔واں قبول پڑے۔نہ آفت دیکھی نہ زلزلا۔اپے بھلے۔تو عالم بھلا۔کسے کون برا بولنا یو وسواس ہے۔بھلائی برائی سب اپنے پاس ہے۔اپے چل نہیں جانتے۔دسریاں پر برا مانتے۔اول اپنی خبر میں اپے رہنا۔پچھے دسرے کوں برا کہنا۔جنے اپس کوں پچھانیا۔انے سب جانیا۔جدھر ڈھلنا ہے۔اودھر عقل کے اجالے میں چلنا ہے۔آدمی نے عقل چھوڑیا۔دیوانہ ہوا اپنا سر اپے پھوڑیا۔عقل میں جو کا کلوت ملتی۔تو حرمت میں نقصان ہوتا۔مدعا دور پڑتا دلتی۔منگتا ہے جو دل کو تازا رکھے مدعا پاوے۔تو بھلا ہے جو عقل میں کا کلوت نا ملاوے۔سکت ہے تو عقل میں ہمت کوں کر شریک۔یو پند ہے اگر تجھہ میں کچہ سمجھہ ہے تو سیک۔جو کوئی یو چلنت چلتا ہے وو کامل ہوتا ہے۔روشن طبیعت زندہ دل ہوتا ہے۔عقل میں کاکلوت جوں ریشم میں سوت جوں دود میں چھاچھہ۔جوں پاچ میں کاچہ............"

خاتمۂ کتاب

"ہزار شکر کہ بارے الحمداللہ کتاب تمام ہوا۔مقصود حاصل ہوئے سب کام ہوا زور سوں نہیں آتا فام۔سمج سوں آلگتا کام۔اتال جوں حسن ہور دل اپنی مراد کوں انپڑے۔اپنی کمال اعتقاد کو انپڑے۔تیوں بادشاہ ہور بادشاہ کے دوستاں۔بادشاہ کے عزیزاں۔بادشاہ کے خویشاں قرابتاں۔بادشاہ کی پیاریاں پیارے۔مانتے منگنہارے بادشاہ کے خدمتگاراں۔دولت خواہاں۔دعا گویاں۔امیدواراں۔سب اپنی مراد کو انپڑو انو کوں غیب کی نعمت سنپڑو۔رزق فراخ اچھو۔ہمیشہ بعیش و عشرت اچھو۔ دایم بدولت اچھو۔عاقبت بخیر اچھو۔ایماں سلامت اچھو۔آمین یا رب العالمین"

اب رہی کتاب کی زبان۔سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس کی حالت بہت کچھہ اوپر کے نمونے سے ظاہر ہے۔طرز بیان اگرچہ سادہ اور صاف ہے لیکن زبان قدیم ہے بہت ایسے الفاظ اور محاورے ایسے آتے ہیں جو اس وقت بالکل سمجھہ میں نہیں آتے اور جن کی تحقیق میں بہت کچھہ کاوش کرنی پڑی۔زبان کے صرف و نحو میں بھی اس وقت کی زبان سے بہت فرق ہے—میں اس کے متعلق کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضمن میں بہت کچھہ لکھہ چکا ہوں۔بالکل وہی باتیں اس میں بھی پائی جاتی ہیں—مثلاً

۱-اکثر عربی الفاظ کے املا کو سادہ کر دیا ھے یعنے جس طرح بولے جاتے ہیں ویسے ھی لکھہ دئے ھیں جیسے نفع کو نفا یا وضع کو وضا یا وزا یا وزاں-واقعہ و واقا-منع کو منا-طمع کو طما-معاملہ کو ماملہ-معنے کو مانا-چنانچہ طمع کا قافیہ جما یا جیا لکھا ھے-مثلاً وو عبث جیا جس کے دل میں یو نہیں طما—

۲-مؤنث میں فعل کی جمع جیسے "اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دسرے مرد کوں اپنا حسن دیکھلانا گناہ کر جانتیاں ھیں-اپنے مرد کوں ھر دو جہاں میں اپنا دیں و ایماں کر پچھانتیاں ھیں"

۳-اسی طرح اضافت کی بھی جمع آتی ھے-مثلاً اسکیاں انکھیاں لالی-دل کے فائدے کیاں بہت باتاں ھیں—

۴-اسی طرح جتنی-ایسی-جیسی کی جمع جتنیاں-ایسیاں-جیسیاں وغیرہ—

۵-کر کا استعمال-جیسے دانا ھمنا رھنما کر جانے گا-اگر بولوں گا دشمن کر جانے گا

۶-سی مستقبل کے لئے-جیسے-بعض کہتے ھیں کہ خدا کوں اس نظر سوں دیکھیانا جا سی-نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نا آسی—

۷-اردو میں اکثر الفاظ کا تکرار ھوتا ھے اور خاص معنے پیدا کرتا ھے-جیسے گھر گھر-در در-مگر قدیم دکنی اردو میں ان دو کے درمیان ے کا اضافہ کرتے تھے-مثلاً گھرے گھر-درے در-تھارے تھار-رگے رگ-وغیرہ—

۸-مانگنا بمعنی چاھنا-یہ استعمال اکثر انگریزوں کی زبانی سنا گیا ھے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ انہیں کی ایجاد ھے-لیکن قدیم دکنی اردو میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ھوتا ھے-جیسے اگر منگتا ھے غمکوں مارے شراب ھے-اگر منگتا ھے جفا ترے آنگے ھارے شراب ھے-اگر منگتا ھے سخاوت پر آنے تو شراب پی-اگر منگتا ھے رن میں گھوڑے بہانے تو شراب پی-اگر منگتا ھے حسن کا نظارا کرنے تو شراب پی-اگر منگتا ھے دل میں محبت بھرے شراب پی-اگر کچھہ اونچا چڑنے منگتا ھے تو شراب پی-اگر خدا کو انپڑنے منگتا ھےتو شراب پی—

۹-الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی کچھہ زیادہ خیال نہیں کیا-مثلاً شراب-خبر-صورت-دنیا کو مذکر لکھا ھے—

غرض اسی قسم کی اور بھی کئی باتیں ھیں جو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ھوتی ھیں اور جنھیں ھم اس موقع پر تفصیل سے نہیں لکھہ سکتے-یہ کتاب عنقریب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کی جائے گی-شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں مفصل فرہنگ ھوگی-کتاب کی صحت بڑی احتیاط اور غور سے کی گئی ھے-قدیم زبان کا سمجھنا اور قلمی نسخوں کا پڑہ کر صحیح کرنا آسان کام نہیں ھے—

فردوسی کا مذہب

از

(جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے-پی-ایچ-ڈی
پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

(یہ مضمون امام المستشرقین پروفیسر نولڈکی کی اس کتاب سے ماخوذ ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں رزمیات ایران پر تصنیف کی ہے-پروفیسر موصوف کی ذات محتاج تعریف نہیں-وہ ہنوز زندہ ہیں اور اس وقت ان کا سن نوے برس کے قریب ہے-لیکن ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ اب تک جاری ہے-کتاب مذکور انہوں نے اول بار سنہ ۱۸۹۶ ع میں لکھی تھی اور اب سنہ ۱۹۲۰ ع میں بار دوم اسے مزید تصحیح اور اضافات کے ساتھہ شایع کیا ہے-جناب ڈاکٹر صاحب پوری کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں شایع ہوگا—

فردوسی کے مذہب پر پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے بھی ایک مضمون لکھا ہے-یہ مضمون تین سال ہوئے جب لکھا تھا اور اب تک شایع نہیں ہوا-اس کی تحریر کے وقت انہیں پروفیسر نولڈکی کے مضمون کی مطلق اطلاع نہ تھی-فاضل پروفیسر نے ازرہ کرم وہ مضمون ہمیں عنایت فرمایا ہے جو جنوری کے نمبر میں شایع ہوگا-اڈیٹر)

فردوسی کے مذہبی رجحان کی تحقیق کرنا خاص دلچسپی کا موجب ہے*لیکن یہ ذرا زحمت طلب کام ہے کیونکہ شہادات کسی قدر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں-اول تو یہ مطلق ضروری نہیں کہ ایک مشرقی شاعر مذہبی سر زمین کے اندر

---

* سر زمین مشرق میں مذہب کو اہمیت حاصل ہے-اس کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھہ بحث کی جائے—

(جس میں شدید اندرونی اختلافات کا دور دورہ ہے) عقائد کے تغیر سے ہمیشہ محفوظ رہا ہو ہم دیکھتے ہیں کہ بزرگان دین بھی جو امور مذہبی میں غور و خوض کرنے کے عادی ہوتے ہیں سدا اپنے اعتقادات پر مستقل نہیں رہتے-اس پر ایک مزید دقت یہہ ہے کہ شاہنامے کے وہ منفرد اشعار جن میں مذہبی عقیدے کا اظہار پایا جاتا ہے بعد والوں کے اضافہ کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں*-یا بعض اشعار ایسے ہیں کہ وہ ہیں تو فردوسی کے لکھے ہوئے لیکن ان میں خفیف سا تغیر کرکے مطلب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے-پھر ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات فردوسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کو تمام و کمال اور بے ریائی کے ساتھ بیان کرسکتا-اس کو اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنے خوش عقیدہ ناظرین کے سامنے اپنے تئیں خوش عقیدہ ظاہر کرے-غرض یہ کہ ان دقتوں پر نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ ہم ایک بالکل صاف اور یقینی نتیجے پر پہونچ سکیں گے-

فردوسی اپنی قوم کی قدیم روایات کا تہ دل سے دلدادہ تھا-جو اشعار اس نے شاہان ایران اور وہاں کے قدیم سورماؤں کی شان میں لکھے ہیں ان کے ہر لفظ سے شاعر کی ارادت و محبت ٹپکتی ہے-ان سب کو وہ شروع سے آخر تک بزرگان خدا پرست بتاتا ہے اور جو شخص شاہنامے کو بغور پڑھے اس کے دل پر یہی نقش بیٹھتا ہے کہ فردوسی یہ فرض کئے ہوئے ہے کہ وہ سب کے سب خدائے کریم کے جوار رحمت میں داخل ہو چکے ہیں-دقیقی زرتشتی کے حق میں وہ دعا کرتا ہے کہ خدا اس کے گناہوں کو بخشے اور قیامت کے دن اس پر اپنی رحمت کا سایہ کرے-

خدایا ببخشا گناہ ورا بیفزائے در حشر جاہ ورا

(شاہنامہ ص ۱۹ س ۳)-ایک پکا مسلمان شاید ایسی دعا نہ مانگ سکے-لیکن یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ فردوسی صرف اسلام کے پردے میں ایک مجوسی تھا-در اصل اس کا طبعی میلان مذہب زرتشت کے ان عقائد کی طرف تھا-جو بلند معیار ہونے کے باوجود مطابق عقل بھی ہوں-اس قدیم مذہب کی ایسی باتوں کا جو نہ صرف اہل اسلام بلکہ روشن خیال اصحاب کے لئے قابل نفرت ہوں ذکر کرنے سے اس نے یا تو پہلو تہی کی ہے یا ان کی تاویل کرلی ہے-یا اگر اس نے خود نہ کی ہو تو اس سے پہلے خدائی نامے (جو شاہنامہ کا ماخذ ہے) کے مولفوں نے کی ہوگی-اگرچہ اس نے خود بھی قدیم ایرانیوں کو محاورہ زبان کے عام استعمال کے مطابق "آتش پرست" کہا ہے تاہم ساتھ ہی آتش پرستی کے الزام کو بھی ان پر سے دور کیا ہے کہ آتش تو فقط سمت نماز کی

---

* دیکھو اس مضمون کے آخر میں—

تعیین کے لئے ھے ورنہ حقیقی پرستش تو دراصل خدائے واحد ھی کی مقصود ھے—

ھے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود   قبلے کو اھل نظر قبلہ نما کہتے ھیں

چنانچہ شاھنامہ (ص ۳۰۳ س ۱۴ و ۱۵) میں وہ کہتا ھے—

بیک ھفتہ بر پیش یزداں بدند   مپندار کاتش پرستاں بدند
کہ آتش بداں گاہ محراب بود   پرستندہ را دیدہ پر آب بود

ایسے ھی ایک زرتشتی قیصر روم سے کہتا ھے کہ "برترین عناصر" (یعنی آگ) ھمارا قبلہ ھے—

ھماں قبلہ شان برتریں گوھراست   کہ از خاک و آب و ھوا برتراست

(شاھنامہ ص ۵۶۹ الف س ۲۷) اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ فردوسی مذھب کا قائل تھا وہ پکا خدا پرست اور موحد ھے اور یہی اصولی عقیدہ وہ برابر اپنے ممدوح سورماؤں کی طرف بھی منسوب کرتا ھے حتی کہ سکندر کی طرف جو اس کے نزدیک عیسائی ھے۔خدائے واحد۔خلاق جہاں۔علیم و قدیرکی جو عظمت اس کے دل میں ھے اس کا اظہار ھر موقع پر وہ ایسے طریقے سے کرتا ھے کہ وہ فقط ایمان راسخ ھی کا نتیجہ کہا جا سکتا ھے۔اس کے نزدیک انسان اس بات کو معلوم نہیں کر سکتا کہ خدا کی ذات و صفات کی نوعیت کیا ھے صرف اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ھے کہ خدا ھے—

بہ بینندگاں آفرینندہ را   نہ بینی مرنجان دو بینندہ را
نیابد بدو نیز اندیشہ راہ   کہ او برتر از نام واز جائگاہ
سخن ھرچہ زیں گوھراں بگذرد   نیابد بدو راہ جان و خرد
خرد گر سخن بر گزیند ھمی   ھمان را گزیند کہ بیند ھمی
ستودن نداند کس اورا چو ھست   میاں بندگی را ببایدت بست
خرد را و جان را ھمی سنجد او   در اندیشۂ سختہ کے گنجد او
بدین آلت و رای و جان و روان   ستود آفرینندہ را چوں تواں
بہستیش باید کہ خستو شوی   زگفتار بیکار یکسو شوی
پرستندہ باشی و جویندہ راہ   بفرماں نہا ژرف کردن نگاہ
ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست   بہستیش اندیشہ را راہ نیست

(شاھنامہ ص ۱۷)

ترا کردگاریست پروردگار   توئی بندۂ کردۂ کردگار
چو گردن باندیشہ زیر آوری   زھستی مکن پرسش و داوری
نشاید خور و خواب و با او نشست   کہ خستو نباشد بیزداں کہ ھست
دلش کور باشد سرش بی خرد   خرو مندش از مردماں نشمرد
زھستی نشانست بر آب و خاک   زدانش مکن خویشتن در مغاک

توانا و دانا و دارندہ اوست — خرد را و جاں را نگارندہ اوست

(شاھنامہ ص ۱۹۲-۱۹۳) زرتشتی مذھب میں ثنویت کے عقیدے کی وہ تردید کرتا ھے-اس کے نزدیک خدا ھی نیک و بد اور ھست و نیست کا خالق ھے—

خداوند ھست و خداوند نیست — ھمہ بندگانیم و ایزد یکیست

(شاھنامہ ص ۵۲ س ۱۶)

ازو یست نیک و بدو ھست نیک — ھمہ بندگانیم و ایزد یکیست

(ص ۵۷ س ۲) آغاز شاھنامہ میں حمد کے جو اشعار ھیں ان سے مطلق خدا پرستی کا عقیدہ ظاھر ھوتا ھے نہ مخصوص طور سے اسلامی عقیدہ-اپنے بیٹے کے مرثیے میں بھی جہاں اس کا دل اپنے صادق ترین جذبات کا اظہار کر رھا ھے اس نے کوئی بات ایسی ظاھر نہیں کی جو اس کے حقیقی اسلامی رجحان پر دلالت کرتی ھو-جہاں اس نے سکندر کی زیارت کعبہ کا حال لکھا ھے (جس کا مأخذ اسلامی روایات ھیں) وھاں کہا ھے کہ خدا ے دو جہاں کے لئے حیز و مکان غیر ضروری ھے—

خداي جہاں را نیاید نیاز — بجای خور و کام و آرام و ناز

(شاھنامہ ص ۳۹۶ س ۲۷) اس میں صاف طور سے اس نے ''بیت اللہ'' کے اسلامی مفہوم میں ایک اختلافی عقیدے کا اظہار کیا ھے*-عرب کے اس مقدس مقام (یعنی کعبے) کا ذکر اس نے بالکل ویسے ھی معمولی طور سے کیا ھے جیسا کہ مجوسیوں کے مقامات مقدسہ کا جہاں وہ آگ کے سامنے خداے حقیقی کی پرستش کرتے ھیں+-ایک جگہ وہ کہتا ھے کہ قدما کے لئے آگ ٹھیک اسی طرح سمت نماز کی تعیین کرتی ھے

---

* اسی کے ساتھ ھی ایک اور شعر اس عقیدے کی تردید میں موجود ھے—

خداوند خواندیش بیت الحرام — بدو شد ترا راہ یزداں تمام

(شاہنامہ ص ۳۹۶ س ۲۶) لیکن لیڈن کے قلمی نسخے میں یہ شعر نہیں ھے اور کوئی شک نہیں کہ کسی نے بعد میں اضافہ کیا ھے—

+ لیکن شاعر کے یہ الفاظ کہ—

گرت ھست جامی مئے زرد خواہ — بدل خرمی را مداں از گناہ

(ص ۴۹۴ س ۲۷) کوئی خاص طور سے اسلامی تعلیم کی مخالفت میں نہیں کہے گئے بلکہ محض خوش طبعی کا اظہار ھے جیسا کہ اکثر مشرقی شعراء کے کلام میں ھوتا ھے-لیڈن کے نسخے میں اس خلاف شرع شعر کو ترک کردیا گیا ھے اور شتراس برگ کے دونوں نسخوں میں اس سے اگلے شعر کو بھی ساتھ ھی حذف کیا گیا ھے جو یہ ھے—

نشاط و طرب جوی و مستی مکن — گزافہ میندار مغز سخن

لیکن ان میں سے ایک نسخے میں ان دو شعروں کی بجائے ایک اور شعر لکھدیا گیا ھے جس میں قافیہ یہی ھے—

جیسے کہ اہل عرب کے لئے پتھر—

بداں گہ بدی آتش خوبرنگ　　چو مرتازیاں راست محراب سنگ

(شاھنامه طبع فولرس ص ۱۸ س ۱۷) اس سے بھی فردوسی کے دل میں اسلام کی کوئی خاص عظمت ظاھر نہیں ھوتی-اس پر یہ اعتراض بے شک ھوسکتا ھے کہ "پتھر" سے مراد زمانۂ جاھلیت کے بت بھی لئے جاسکتے ھیں لیکن ھم کو اس میں شبہ نہیں کہ شاعر کے ذھن میں اس شعر کو لکھتے وقت حجر اسود کا خیال تھا جس کی طرف اھل اسلام عندالصلوۃ اپنا رخ کرتے ھیں—

نئے مذھب (اسلام) کے مبلغین یعنی اھل عرب سے فردوسی کو یقیناً نفرت ھے وہ کہتا ھے کہ یہ لوگ اپنے ذاتی فائدے کی خاطر اپنے آقا سے دغا کرتے ھیں—

نباشند یاور ترا تازیاں　　چو جائی نیابند سود و زیاں

بدرد دل اندر بآزار نیز　　بدشمن سپارندت از بہر چیز

(شاھنامه ص ۵۶۱ س ۲۱) وہ بھوکے اور قلاش لوگ ھیں—

بدیں تخت شاھی نہادست روی　　شکم گرسنه مرد دیہیم جوی

(ص ۶۱۰ س ۱۷) یزدگرد عرب فاتحین کے متعلق طوس کے مزربانوں کو لکھتا ھے کہ "یہ مار خور دیو صورت لوگ جو دانائی اور شرم سے بے بہرہ ھیں اور جن کے پاس نہ دولت ھے نہ شہرت نہ اقبالمندی نہ شرافت تمام دنیا کا ستیا ناس کیا چاھتے ھیں"—

ازیں مار خور اھرمن چہرگان　　ز دانائی و شرم بی بہرگان

نه گنج و نه نام و نه تخت و نژاد　　همیداد خواهند گیتی بباد

(ص ۶۱۰ س ۱۶) ایسے ھی اگلے شعر میں ان کی سیاہ رنگت کی وجہ سے ان کو "زاغ ساران"* کہا ھے اور یہی لقب ایک وطن پرست ایرانی عربوں کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کے لئے استعمال کرتا ھے—

---

* اس لفظ سے ھم کو عہد شجاعت میں ایرانیوں کے افسانوی دشمنوں کی یاد آتی ھے جن کو "سگ ساراں" اور "گرگ ساراں" کہا گیا ھے اھل شام نے بھی اپنے زمانے کے عربوں کو بہ تفاوت یسیر "غراوے" (بمعنی کوا در زبان سریانی) کہا ھے-دیکھو تامس مرگاوی (Thomas of Marga) طبع بج (Budge) ص ۳۱۶ س ۱۵ مصنف-تامس نویں صدی عیسوی میں عراق میں کسی خانقاہ کا راھب تھا اسکی جس کتاب کا یہاں حوالہ دیا گیا ھے وہ اس خانقاہ کے رھبان و مجاورین کی تاریخ ھے جو اس نے سریانی زبان میں لکھی تھی اور جس کو بج صاحب نے مع انگریزی ترجمے کے چھپوایا ھے - مترجم

بدست یکی زاغ سرگشته شد بما بر چنیں روز برگشته شد

(ص ۶۱۱ س ۹) اسی مقام پر اگلے شعر میں ایرانی سپہ سالار رستم کے حق میں جزائے خیر کی دعا کی ھے اور اس کے مقابلے میں سعد کو موت کی بد دعا دي ھے—

که یزدان و را جائے نیکان دهاد سیه زاغ را زخم پیکان دهاد

گذشته صفحات میں جس پیشینگوئی کا ذکر کیا جا چکا ھے اس میں فردوسی نے عہد اسلام کو ایران کے قومی بادشاھوں کے لئے سخت بد بختی کا موجب بتلایا ھے اور اسی خیال کو اس نے یزدگرد کے خط میں بھی نظم کیا ھے—

شود خوار هرکس که بود ارجمند فرومایه از بخت گردد بلند

پراگنده گردد بدی در جهان گزند آشکارا و خوبی نهان

بهر کشوری در ستمکارهٔ پدید آمد و زشت پتیارهٔ

نشان شب تیره آمد پدید زما بخت فرخ بخواهد برید

(شاهنامه ص ۶۱۰) اسی کے ساتھ سپہ سالار رستم کے خط کا حسرت آمیز لہجہ بھی قابل غور ھے جسمیں اس نے قومی سلطنت کی تباھی پر خیالات کا اظہار کیا ھے (شاهنامه ص ۶۰۶) لیکن یہہ سب ایسے انداز میں لکھا گیا ھے که اسکے محض لفظی ترجمے سے شاعر کا اسلام سے تنفر واضح نہیں ھوتا اور عربوں کے خلاف نفرت کا اظہار تو اکثر ایرانی مصنفین کے ھاں پایا جاتا ھے حتیٰ که ان لوگوں کے ھاں بھی جو پکے مسلمان ھوئے ھیں اگرچه خوش عقیدگی کے نقطۂ نظر سے یہہ بات ھمیشه مذموم خیال کی جاتی ھے—

شاهنامه (صفحه ۳۹۲) میں فردوسی نے چار مذھبوں کا ذکر کیا ھے که نوع انسان اس کے نزدیک انہی چاروں میں منقسم ھے یعنی (۱) ایرانی (مجوسی)- (۲) یہودی-(۳) یونانی (عیسائی)-(۴) عربی (اسلام) اور اس موقع پر بھی اس نے اسلام کی افضلیت کو دو چار لفظوں میں بیان کر کے ٹال دیا ھے-

یکی دین دهقان آتش پرست که بی باژ برسم نگیرد بدست

دگر دین موسی که خوانی جهود که گوید جز این دین نشاید ستود

دگر دین یونانی آن پارسا که داد آورد در دل پادشا

چهارم ز تازی یکی دین پاک سر هوشمندان بر آرد ز خاک

هم دیکھتے ھیں که مذھبی مناقشات سے فردوسی کو بالکل دلچسپی نہیں ھے- بندوی ایرانی اور ینانوس رومی کے مابین ارکان مذھب کے بارے میں جو مناظره اس نے نظم کیا ھے (شاهنامه صفحه ۵۷۳) اس سے صاف اس خیال کی تائید ھوتی ھے-ایک اور مقام پر وه کہتا ھے که بادشاه کے لئے مذھب ضروری چیز ھے لیکن رعایا کے اندر مختلف مذاھب کا پایا جانا کوئی مذموم امر نہیں- محض باتوں سے دنیا اجڑ نہیں

سکتی-انسان کو چاهئیے که اپنے دلی عقائد کا علانیه اظهار کرے—

جهاندار بی دین جهان‌را ندید　　اگر هر کسی دین دیگر گزید
یکی بت پرست و دگر پاک دین　　یکی گفت نفرین به از آفرین
زگفتار ویران نگردد جهان　　بگوی آنچه رایت بود در نهان
چو بی‌دین بود پادشا همچنین　　نیابد بگیتی ز کس آفرین
بود دین و شاهی چوتن با رواں　　بدین هردوان پایدارد جهان

(شاهنامه ص ۵۲۴ س ۲۲-۲۳)-هندوستان کے بت پرست راجه اور ایران کے یزدان پرست بادشاه کے درمیان عهد دوستی و وفاداری کو وه همدردی اور استحسان کی نظر سے دیکھتا هے—

دو شاه بت آرای و یزدان پرست　　وفارا بسودند با دست دست
کزاینپس دل از راستی نشکنیم　　همه بیخ کژی زبن بر کنیم
وفادار باشیم تا جاودان　　سخن بشنویم از اب بخردان

الخ (شاهنامه ص ۴۷۰)-اوپر هم اس بات کی طرف اشاره کر آئے هیں که سکندر اعظم کی شخصیت میں فردوسی نے عیسائیت کا ذکر تعریف کے ساتهه کیا هے (دیکهو صفحه ۳۲)-لیکن اسی کے ساتهه یهه بات بهی قابل توجه هے که عیسائی رهبان جو بد نصیب یزدگرد کو آداب و احترام کے ساتهه دفن کرتے هیں اسکو مرحوم و مغفور اور جنت الفردوس میں مقیم خیال کر رهے هیں (شاهنامه ص ۶۱۳)-دراصل وه شاعر کے اپنے خیالات کی ترجمانی هے جس کے نزدیک ایک دیندار عیسائی اور دیندار مجوسی کافر نهیں هے-غرض یهه که هم کو فردوسی کی طبیعت میں کهیں مذهبی جنون یا تعصب کا شائبه نظر نهیں آتا—

بعض مقامات بیشک ایسے بهی هیں جن میں عیسائیت کے خلاف متعصبانه راے کا اظهار کیا گیا هے لیکن وه کوئی اسلامی نقطۂ نظر سے نهیں لکهے گئے بلکه عیسائیوں کے ساتهه پارسیوں کے مذهبی مناظروں کا پرتو هے جن کو فردوسی نے زمانۂ متاخر (یعنی ساسانی زمانے) کے پارسی مآخذ میں دیکها هے اور اس میں کسی قدر ایران اور عیسائی روم کے سیاسی مناقشات کا بهی اثر هے-مثلاً یهه قول که—

مسیح فریبنده خود کشته شد　　چو از دین یزداں سرش گشته شد

(شاهنامه ص ۴۹۳ س ۳۱) اسلامی عقیدے کی روسے بالکل قابل رد هے-ایک اور مقام پر ایک پارسی قیصر روم کو ملامت کرتا هے که عیسائی لوگ اپنے نبی کے اس فرمان کی پروا نهیں کرتے که اگر تمهارے ایک گال پر کوئی تهپڑ مارے تو دوسرا بهی اسکے سامنے کردو (متی باب ۵ آیت ۳۹-لوقا باب ۶ آیت ۲۹)-اور بجائے تقوي اور پرهیز گاري کے جو عیسیٰ کی سنت هے عیاشی میں زندگی بسر کرتے هیں اور

ایک معمولی شخص کو جس کو یہودیوں نے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا خدا کا بیٹا بناکر اسکی پرستش کرتے ہیں—

نہ بینی کہ عیسی مریم چہ گفت — بدانگہ کہ بگشاد راز از نہفت
کہ پیراهنت گر ستاند کسی — میاویز با او بہ تندي بسی
وگر برزند کف برخسار تو — شود تیرہ از زخم دیدار تو
میاور تو خشم و مکن روی زرد — بخواباں تو چشم و مگو هیچ سرد
بکہتر خورش بس کن از خوردنی — مجوی ار بنا شدت گستردنی
شما را هوا بر خرد شاہ گشت — دل از آز بسیار بیراہ گشت
بہر جای بیداد لشکر کشید — از آسودگی تیغہا بر کشید
همہ چشمہ گردد بیاباں ز خوں — مسیحا نبود اندریں رهنموں
یکی بینوا مرد درویش بود — کہ نانش ز رنج تن خویش بود
چو آورد مرد جہودش بہشت — چو بی یار و بیچارہ دیدش بکشت
هماں کشتہ را نیز بردار کرد — بداں دار دیں ورا خوار کرد
تو گوئی کہ فرزند یزداں بد او — بداں دار برگشتہ خنداں بد او

(شاهنامہ ص ۵۶۹ الف) اس مقام میں بھی یہ بات کہ حضرت عیسی کو واقع میں مصلوب کیا گیا قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔آگے چل کر دو جگہ عیسی کی الوهیت کے خلاف مناظرہ کیا گیا ہے ص ۵۸۷ و ۵۹۹ اور چونکہ اس مسئلے میں مسلمان اور مجوسی عیسائیوں کے خلاف متفق ہیں لہذا فردوسی نے نہایت یکسوئی اور اطمینان کے ساتھہ اس کی تائید کی ہے لیکن مجوسی علماء کے مذهبی تعصب کے خلاف شاہ هرمز نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھہ رواداری کا سلوک واجب ہے* اس پر فردوسی نے اپنی رائے کا کچھہ اضافہ نہیں کیا—

دگر گفت کای شہریار بلند — کہ هرگز بجانت مبادا گزند
جہوداں و ترسا ترا دشمن اند — دو رویند و باکیش اهریمنند
چنیں داد پاسخ کہ شاہ سترگ — ابی زینہاری نباشد بزرگ

(شاهنامہ ص ۵۲۴) یہودیوں کے متعلق اس نے متعدد جگہ حقارت آمیز رائے کا اظہار کیا ہے اور هندو مذهب کی بھی اس نے ایک جگہ غیر همدردانہ تشریح کی ہے (دیکھو شاهنامہ ص ۵۶۹ الف)

دوسرے مذاهب کے متعلق فردوسی کے فتووں کا انحصار زمانۂ متأخر کے مآخذ پر ہے لیکن اس قدر یقینی ہے کہ اس کی بجائے اگر کوئی راسخ‌الایمان مسلم

---

* دیکھو طبری-جملہ ۱ ص ۹۹۰-۹۹۱—

ہوتا تو اپنے خیالات کا اظہار بالکل مختلف طریقے سے کرتا۔ بااین ہمہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں فردوسی صاف ایک مسلم کے بھیس میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ان میں یقیناً بعض اشعار (خصوصاً لیڈن والے نسخے میں) جن میں محمد اور ان کے صحابہ پر ہزار ہزار درود و سلام بھیجے گئے ہیں* اپنی جگہ پر بے محل معلوم ہوتے ہیں اور بلا شبہ بعد کی ایجاد ہیں۔اسی طرح رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق کسریٰ انوشیرواں کے خواب پر جو فصل ہے (شاہنامہ ص ۵۳۱ وہ پوری کی پوری الحاقی ہے چنانچہ وہ مول کی اڈیشن میں اور نیز ان تین قلمی نسخوں میں جو اس وقت میرے پیش نظر ہیں موجود نہیں ہے۔محمود کی شان میں ایک جگہ ایک شعر ہے—

زمنبر چو محمود گوید خطیب بدین محمد گراید صلیب

(شاہنامہ ص ۵۲۴ س ۳۰) لیکن اس میں کسی اسلامی سرگرمی کا اظہار نہیں ہے بلکہ دراصل صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ محمود غازی اسلام ہے+۔رستم کے نام سعد وقاص کے خط میں فردوسی نے تمام اسلامی عقائد کو مختصراً نظم کیا ہے (شاہنامہ ص ۶۰۷) لیکن اخیر میں اپنی رائے کا اضافہ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا برخلاف اس کے دیباچہ میں ایک پوری فصل ''ستائش پیغمبر و یارانش'' کے لئے وقف کی گئی ہے (ص ۱۸ جس میں شاعر نے محمد کی نبوت کا اقرار کیا ہے۔اس فصل کے اصلی ہونے میں مجال شک نہیں اور لہذا اسی کی مطابقت میں بعض اور اشعار بھی مثلاً—

درودی فرستی به پیغمبرش که صلوات تاج است بر منبرش

(ص ۴۲۷ س ۱۲) جو میرے ہاں سب نسخوں میں موجود ہے اصلی ہو سکتے ہیں اور طبعاً یوسف و زلیخا کے دیباچے میں اس قسم کے اشعار اور بھی زیادہ ہیں۔لیکن ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر فردوسی اس طرح سے مذہب کا اقرار نہ کرتا تو اس پر سختی سے ارتداد کا الزام لگایا جاتا اور بلا تأمل سزاے موت کا مستوجب ہوتا۔محمد کے مرسل من اللہ ہونے پر فردوسی کا ایمان صحیح اسلامی عقائد کے معیار پر تو مشکل سے پورا اترے گا سچ پوچھئے تو ہم تو اتنا بھی تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ کی نبوت پر وہ کسی طرح سے بھی مطمئن تھا۔البتہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کی

---

* مثلاً یہ شعر اکثر آیا ہے—

ہزاران درود و ہزاران سلام ز ما بر محمد علیه السلام

+ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اصلی ہے اگرچہ میرے قلمی نسخوں میں موجود نہیں ہے جن میں اس مقام پر مضمون بالکل دگرگوں ہے—

عظمت کا احساس اس کے دل میں ضرور تھا۔مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو دیباچۂ شاھنامہ (ص ۱۸) میں ھیں اور جن کا متن نظامی عروضی کے ھاں (چھار مقالہ ص ۴۹) بھی بعینہ وھی ھے جو آج شاھنامے میں پایا جاتا ھے لیکن ھجو کے اندر مختلف ھے —

حکیم این جہاں را چو دریا نہاد — بر انگیختہ موج ازو تند باد
چو ھفتاد کشتی برو ساختہ — ھمہ بادبانہا برافراختہ
یکی پہن کشتی بسان عروس — بیاراستہ ھمچو چشم خروس
محمد بدو اندروں باعلی — ھماں اھلبیت نبی و وصی
اگر خلد خواھی بدیگر سرای — بنزد نبی و وصی گیرجای
گرت زین بدآید گناہ منست — چنین است آئین وراہ منست
بریں زادم و ھم بریں بگذرم — چناں داں کہ خاک پئی حیدرم

چونکہ سلطان محمود کے عہد حکومت میں مذھب تشیع سخت بدگمانی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لہذا اس زمانے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار صورت حالات کو دیکھتے ہوئے غیر محتمل معلوم ھوتا ھے لیکن ان اشعار کی اصلیت اٹل ھے کیونکہ سلجوقیوں کے عہد میں بھی جو کٹر سنی ھوتے ھیں محمود سے کم نہ تھے اس قسم کے شیعی عقائد کو بیچ میں اضافہ کرنے کا کوئی خاص باعث نہیں ہو سکتا تھا* ۔ھجو کے اندر فردوسی نے خود بھی بار بار جتلایا ھے کہ میں اپنے ملحدانہ (یعنی شیعیانہ) عقائد کے اظہار کی وجہ سے سلطان کی نظر میں کھٹک رھا ھوں اور اسی کے ساتھہ وہ روایت بھی متفق ھے کہ فردوسی کے ساتھہ محمود کی ناخوشنودی کی وجہ اس کا میلان تشیع تھا۔البتہ جب اس نے یوسف زلیخا تصنیف کی تو اس کے پاس کافی وجہ موجود تھی کہ اپنے کو علانیہ شیعی کہے کیونکہ آل بویہ اگرچہ سنی خلیفہ کے معاون و محافظ تھے تاھم خود مذھباً شیعی تھے†۔پھر اس کے علاوہ فردوسی کا آبائی وطن (طوس) اس سرے سے اس سرے تک شیعی تھا۔جس زمانے میں خلیفہ ھارون الرشید اپنے آخری ایام وھاں بسر کر رھا تھا تو " شانی امیرالمؤمنین " (یعنی حضرت علی سے بغض رکھنے والا) کے لقب سے مشہور تھا‡ اور یہ بات خود

---

* مصنف کا اشارہ یہاں نظامی عروضی کے متن کی طرف ھے کیونکہ وہ سلجوقیوں کا معاصر تھا ۱۲ مترجم —

† لیکن زلیخا کے اندر جو اشعار اھل سنت کے لئے دل آزاری کا باعث ھوسکتے تھے ان کو بعض نسخوں میں بدل کر سنی عقائد کے مطابق کردیا گیا ھے —

‡ دیکھو کتاب الاخبار الطوال للدینوری صفحہ۳۸۸ —

اس ذی اقتدار شہنشاہ سے جو اس وقت مرض‌الموت میں گرفتار تھا پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس میں شک نہیں کہ ہارون‌الرشید نے آل علی کی ایذا رسانی میں کچھہ کمی بھی نہیں کی تھی—

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو قدامت ایران کا اس قدر سرگرم مداح ہے-اہل عرب کا علانیہ دشمن ہے-غیر مذہب کا پاس کرتا ہے اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ خود پرجوش مسلم نہیں ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ داماد رسول عربی کا اس درجہ گہرا احترام اپنے دل میں رکھتا ہو جو شیعیان علی کے ایک فرقے میں یہاں تک بڑھا کہ آخر کو وہ علی کی الوہیت کے قائل ہوگئے؟ یہاں ہمارے سامنے ایک ایسی صورت واقعہ درپیش ہے جو مذہبی سر زمین میں اکثر ظہور پذیر ہوا کرتی ہے اور ایران میں جو سربرآوردہ لوگ گزرے ہیں ان میں سے اکثر کی حالت میں ہم یہی بات دیکھتے ہیں-فردوسی کا معاصر البیرونی جو شاعر تو نہیں ہے لیکن ایک باریک بیں فاضل محقق ہے اس کی بھی بعینہ یہی حالت ہے کہ اس کو اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے-عربوں سے اس کو نفرت ہے لیکن اس پر بھی تشیع کی طرف مائل ہے-اگرچہ شیعہ مذہب صدیوں بعد جاکر ایران کا قومی مذہب قرار پایا تاہم اس کا بیج بہت پہلے سے پھوٹنا شروع ہو گیا تھا*—

ہمارے نزدیک یہ امر قابل تصور نہیں ہے کہ فردوسی نے دیباچے میں ذیل کے اشعار لکھے ہونگے جن میں صحیح سنی تعلیم کے مطابق ابوبکر کو صحابہ میں سب سے مقدم کہا گیا ہے-پھر عمر-پھر عثمان اور چوتھی جگہ پر علی+—

که خورشید بعداز رسولان مه نتابید برکس ز بوبکر به
عمر کرد اسلام را آشکار بیا راست گیتی چو باغ بہار
پس از ہردو آں بود عثماں گزیں خداوند شرم و خداوند دیں
چہارم علی بود که جفت بتول که اورا بخوبی ستاید رسول

یہاں بخوبی یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس موقع پر سلطان کے اپنے عقیدے کی لازمی رعایت سے یہ شعر بیچ میں بڑھا دئے گئے ہیں-فردوسی کا دلی عقیدہ تو اس امر سے کھلتا ہے کہ اس نے علی کا ذکر خیر کس قدر طوالت اور بسط کے ساتھہ کیا ہے اور جو اشعار اوپر لکھے گئے ہیں ان سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی بد مذاق سنی نے

---

* لیکن سعدی با ایں ہمه سنی تھا—

+ پطرز بورغ کے نسخے میں ان اشعار کو کچھہ تو حذف کرکے اور کچھہ بدل‌کر شیعہ عقیدے کے مطابق کرلیا گیا ہے اور یہ کسی نے محض اپنی سمجھہ اور مرضی سے کیا ہے نہ متن کی قدیم روایت کی بنا پر—

ان کو بے محل بیچ میں ٹھونس دیا ھے کیونکہ ان سے تسلسل بیان میں سرتاپا خلل واقع ھو گیا ھے۔ان کے مقابل کا شعر یعنی—

چہ گفت آں خداوند تنزیل و وحی　　خداوند امر و خداوند نہی

ظاھر کرتا ھے کہ یہاں رسول اللہ کے کسی قول کی تمہید اٹھائی گئی ھے۔وہ قول دراصل ان چار شعروں کے مابعد کے شعر میں بیان کیا گیا ھے جو ایک صحیح شیعی حدیث کے مطابق ھے یعنی—

کہ من شہر علمم علیم درست　　درست ایں سخن قول پیغمبرست

اس شعر کا اعادہ ھجو کے اندر بھی کیا گیا ھے۔اب خیال کرنا چاھئے کہ ایک طرف تو خالص شیعی روایت بیان کی جارھی ھے اور بیچ کے چار شعروں میں خالص سنی عقیدے کا اظہار کہاں تک موزوں اور بر محل سمجھا جاسکتا ھے! داستان سکندر کی تمہید میں بھی فردوسی نے اپنے شیعی عقائد کی تائید کی ھے چنانچہ کہتا ھے کہ" معشر صحابہ کے سرگروہ علی ھیں جن کو پیغمبر نے علی ولی کے لقب سے پکارا ھے۔صحابہ سب کے سب معصوم اور خدا ترس ھیں لیکن علی کے اقوال* اعداد و شمار سے باھر ھیں"†—

سر انجمن بد زیاراں علی　　کہ شیعیش خوانند علی ولی

ھمہ پاک بودند و پرھیزگار　　سخن‌ھائے او برگذشت از شمار

برخلاف اس کے عمر کو امیر عرب کہا ھے جس کی تلوار سے دن رات ھو جاتا تھا—

چنان بد کجا سرفراز عرب　　کہ از تیغ او روز گشتی چو شب

(شاھنامہ ص۲۰۶۱) لیکن یہ یقیناً وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے کہا گیا ھے نہ شیعی عقیدے کی وجہ سے۔اس سے اگلا شعر جس میں عمر کی ستائش کی گئی ھے بلا شبہ الحاقی ھے‡۔

عمر آں کہ بد مومنانرا امیر　　ستودہ ورا خالق بی نظیر

لیکن صحابہ کی تعریف خواہ کتنی ھی مختصر طور سے کیوں نہ کی گئی ھو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ھے کہ فردوسی گو شیعہ تھا لیکن غلاۃ میں سے نہ تھا اور اگر ایسا

---

* لیڈن کے نسخے میں "سخنھائے" کی بجائے "صفتھائے" کا لفظ ھے جو زیادہ مناسب ھے—

† فولرس کی اڈیشن میں شاھنامے کا وہ حصہ جس میں یہ اشعار ھیں طبع تو ھوا تھا لیکن شائع نہیں کیا گیا۔میکن کے ھاں یہ ساری فصل مفقود ھے حالانکہ وہ یقیناً اصلی ھے—

‡ مول نے اپنی اڈیشن میں اس کو اور ماقبل کے شعر کو ناحق حذف کردیاھے لیکن لیڈن اور شٹراس برگ کے نسخوں میں دونو موجود ھیں—

ہوتا تو اس کی نوعیت مزاج کے لئے موزوں بھی نہ تھا*—

یہ امر قرین قیاس ہے کہ ہمارا شاعر جو نہ تو اپنے خیالات میں مستقل تھا اور نہ ابوالعلا المعری کی طرح اٹل فولادی طبعیت رکھتا تھا بھرور زمان اسلام کی طرف جو رائج الوقت مذہب تھا زیادہ مائل ہوتا گیا ہوگا اس میں شک نہیں کہ اس نے اکثر جگہ لطف شراب کی تعریف کی ہے لیکن پھر ساتھ ہی بعض جگہ اپنے کو تنبیہ بھی کی ہے کہ اس عیاشی کا کفارہ دے اور دوسری دنیا کو چلنے کی تیاری کرے—

غرض یہ کہ ہم مکرر اس امر کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ فردوسی اپنی زندگی میں یقنیاً کبھی کسی ٹکسالی یا رائج الوقت مذہب کا پرجوش رکن نہیں رہا+—

یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہے کہ مکتب کے علوم درسی جو فردوسی کے زمانے میں متداول تھے (مثلاً دینیات اور علم الکلام وغیرہ) اس نے توجہ کے ساتھ حاصل کئے ہوں گے لیکن ان علوم کے ساتھ اس کو اتنی واقفیت ضرور تھی جتنی کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کو ہونی چاہئے-چنانچہ وہ اپنی نظم میں وقتاً فوقتاً اس واقفیت کا اظہار بھی کرتا ہے (دیکھو آرٹکل ۴۵)-ایک بات خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ ہمارا شاعر جس کی کتاب خوارق عادات-طلسمات اور دیو اور جادو اور بھوت پریت کے افسانوں سے پر ہے متعدد جگہ عقلیات کی طرف میلان کا اظہار کرتا ہے-"خرد" یا "عقل" کے معانی کو اس نے نہایت شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے-شاہنامے کے پہلے ہی شعر میں "خرد" کو بہت بڑا عطیۂ الٰہی بتلایا ہے—

بنام خداوند جان و خرد — کزین بر تر اندیشه بر نگذرد

اور اس کی دوسری فصل "ستائش خرد" کے لئے مخصوص کی گئی ہے—



---

* ناصر خسرو نے بھی اپنی ایک نظم میں جہاں وہ اپنے شیعی ہونے کا اعتراف کرتا ہے (دیوان طبع تبریز ص ۳۸) "عدل فاروقی" کا ذکر خیر کیا ہے البتہ جب وہ اسماعیلی ہوکر غلاۃ میں جا ملا تب اسلے عمر کے محبوں کو قیامت کے دن خدا کی کرسی عدالت کے سامنے ملامتی ٹھہرایا ہے (دیوان ص ۲۴۱)—

+ شاہنامے کی مذہبی بے تعصبی کا مقابلہ جب ہم ان اسلامی اور عیسائی تصانیف کے ساتھ کرتے ہیں جن میں اختلاف عقائد کی بنا پر تاریک و تیرہ تعصب سے اظہار نفرت کیا گیا ہے تو ہمیں بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے—

موسیقی

از

(جناب محمد حسین صاحب عرشی امرتسری)



آغوش کن میں تھا جہاں تھی بند چشم عرشیاں
سونا تھا صحن آسماں تھا ایک خموشی کا سماں
اک دھیمی دھیمی روشنی آگے دبے پاؤں بڑھی
گویا یہ پہلی صبح تھی چشم جہاں جس سے کھلی
تاروں نے آنکھیں کھول دیں روشن قبائیں اوڑھ لیں
افلاک پر خوشیاں ہوئیں فردوس میں دھومیں مچیں
برگ و شجر نو خیز تھے طائر ترنم ریز تھے
نغمے سرورانگیز تھے گویا شراب آمیز تھے
کیا ہی سہانا تھا سماں کیا ہی لطافت تھی عیاں
ناگاہ ابر درفشاں اوپر اٹھا مثل دخاں
گرنے لگی چھم چھم پھوار بہہ نکلے رود و آبشار
پھر لہلہائے سبزہ زار اور جوش میں آئے ہزار
اس وقت ازل کا باغباں مجلس فروز کن فکاں
پروردگار لامکاں تھا محو ابداع جہاں
یا بندۂ نایاب تھا خلاق خاک و آب تھا
کچھ فاتح ابواب تھا کچھ جامع اسباب تھا

ق-۱ نیران کوہ طور سے خورشید و مہ کے نور سے
روی صبیح حور سے خلد ضیا معمور سے
۲ انوار کو حاصل کیا - پھر لحن حوران سہا
اور طائران خوشنوا سے نغمۂ شیریں لیا
کچھہ ابر کی دلچسپیاں کچھہ باغ کی نیرنگیاں
کچھہ حسن کی بے مہریاں کچھہ عشق کی بیتابیاں
رنگ ید بیضا لیا — صدق دم عیسیٰ لیا
خال رخ لیلیٰ لیا — حسن ضو سلمیٰ لیا
قمري سے کو کو لی گئی - رفتار آھو لی گئی
عنبر سے خوشبو لی گئی — عشاق کی خو لی گئی
خالق نے سب یکجا کیا نام اس مرکب حسن کا
"موسیقی آواز" تھا — انساں کو یہ تحفہ دیا
کچھہ بانسری میں بھردیا کچھہ چنگ میں پنہاں کیا
مضراب کو کچھہ مل گیا کچھہ تار بربط کو ملا
جادو طرازان جہاں ذوق مقالش گفتہ اند
محفل فروزان خرد سحر حلالش گفتہ اند *



*

اردو زبان کے متعلق ضروری اعداد

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دارالترجمہ - عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)



سنہ ۱۹۲۱ ع میں اہل ہند کی جو مردم شماری ہوئی تھی اس کے اعداد اور نتائج تحقیقات دو جلدوں میں شائع ہوگئے ہیں - ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مردم شماری میں جہاں لوگوں کا مذہب سن و سال وغیرہ بہت سی باتیں دریافت کی جاتی ہیں وہیں ایک خانہ زبان کا بھی ہوتا ہے جس میں ہر شخص کی مادری زبان کا اندراج کیا جاتا ہے - تاکہ معلوم ہوجائے کہ ملک میں کس قدر افراد کیا کیا اور کتنی زبانیں بولتے ہیں - رپورٹ مردم شماری کے باب نہم میں اس تحقیقات کا نتیجہ اجمالاً پیش کیا گیا ہے اور ہمارے مضمون کو اسی باب کا تبصرہ سمجھنا چاہئے —



پچھلی دو مردم شماریاں ڈاکٹر (سرجورج) گریرسن کے دور میں ہوئیں جو علم السنہ کے ماہر اور ہندوستان کے محکمۂ "تحقیقات لسانی" کے ناظم بھی رہ چکے ہیں - زبانوں کی عامی تحقیقات میں ان کا جوش اور سرگرمی لائق داد ہے لیکن اس جوش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی دونوں مردم شماریوں میں بڑی بڑی زبانوں کی بجائے شمارکنندوں نے چھوٹی چھوٹی بولیوں کی تحقیقات شروع کردی جو آپس میں نہایت جزوی اختلاف رکھتی تھیں اور ہرگز اس قابل نہ تھیں کہ انہیں مردم شماری کی رپورٹ میں ایک مستقل زبان کی حیثیت سے نمایاں کیا جاتا - دوسری اسی باریک بینی نے شمالی ہند میں اردو ہندی کے مناقشے کو بالواسطہ تقویت پہنچائی - زبان کا خانہ ہندو مسلمانوں کی کشمکش کا دنگل بن گیا پنجاب و ممالک متحدہ کے بعض شمار کنندوں نے یہاں بھی اپنی لایعنی تعصبات کا اظہار کیا اور زبان کے متعلق جو اعداد چھپے وہ بہت مبہم اور مشتبہ ہوئے - انہی

دنوں (گذشتہ رپورٹ پر) جو تبصرہ راقم الحروف نے رسالہ الناظر لکھنؤ مین کیا تھا اس میں بھی عہدہداران مردم‌شماري کی اس فتنہ‌زا تقسیم‌لسانی پر سخت نکتہ‌چینی کی تھی- لیکن اس قسم کی تنقید کا تو حکام پر کچھہ اثر ہوا یا نہ ہوا- غالباً اتنا تجربے سے انھیں ضرور معلوم ہوگیا کہ زبان کی ایسی باریک و پیچیدہ تقسیم سے مردم‌شماري کا اصلی مقصد فوت ہوجاتا ہے اور اب جب کہ ڈاکٹر گریرسن کی تحقیقات لسانی (لنگوئسٹک سروے) کے نتائج بھی علیحدہ کئی جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں مردم‌شماري میں مشہور و مروج زبانوں کی تفریق و تفریع کرنا مفت کی زحمت و دردسري ہوگا اور گو اس رپورٹ سنہ ۱۹۲۱ ع میں بھی ممالک ہند کی کل زبانوں کی تعداد ۲۲۲ دکھائي گئی ہے- تاہم غنیمت ہے کہ متمدن علاقوں کی بڑي بڑي اور عام زبانوں کی اس شد و مد سے تقسیم نہیں کی گئی جیسی کہ پہلی مردم شماریوں کے وقت کی گئی تھی—



ہندوستان کی بڑي زبانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اردو یا ہندوستانی کو حاصل ہے اور اس مضمون میں اسی کے اعداد پر بحث کرنی منظور ہے- ڈاکٹر گریرسن کی انوکھی تحقیات نے تو ہندوستان خاص کی اصلی زبان مغربی ہندي قرار دي تھی اور ہندوستانی اور اردو کو اسی نئی زبان کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں بنادیا تھا- پھر ان شاخوں میں اور بہت سے شاخسانے نکالے تھے- مردم شماری کے حکام نے ان کانٹوں میں ا لجھنا پسند نہیں کیا پھر بھی فاضل موصوف کی موشگافی کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ پچھلی مردم شماری تک صرف صوبۂ متحدہ کی چار مختلف زبانیں تسلیم کرلی گئیں (۱) مغربی ہندي (۲) مشرقی ہندي (۳) بہاری اور (۴) وسطی پہاڑي اور اسی تقسیم کے مطابق اعداد تیار کئے—— یا کہنا چاہئے کہ خراب کئے—— گئے- اعداد کی تیاری میں دوسرا فساد اردو- ہندي کے جھگڑے سے پیدا ہوا- حالانکہ اب مردم شماري کے لائق حکام کو اعتراف ہے کہ کوشش و کاوش کے باوجود زبان کے اعتبار سے ان دونوں میں وہ کوئی مابہ‌الامتیاز قایم نہیں کرسکے*! بہ الفاظ دیگر یہ سارا فساد فقط ''انگور'' و ''عنب'' کے اختلاف پر مبنی تھا—

بہر حال صاف معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ مردم شماري اپنی یا ڈاکٹر گریرسن کی پیدا کی ہوئی الجھنوں سے خود بھی اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ اس دفعہ صوبۂ متحدہ کے ذی ہوش مہتمم مردم شماری مسٹر ایڈی نے یہ قاعدہ بنادیا کہ

---

* ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری صفحہ ۱۹۵-

ان لوگوں کی زبان جو صوبے کی مروجہ بولی بولتے ھیں-خانہ زبان میں صرف ہندوستانی کے نام سے درج کی جائے اور صاحب موصوف کو اعتراف ھے کہ اس سیدھے سادے مگر واضح قاعدے سے نہ کوئی مناقشہ پیدا ھوا نہ غلط فہمی اور جو اعداد حاصل ھوئے وہ بالکل قابل اعتماد ھیں—

مسٹر ایڈی کی اس لائق ستائش اصلاح کے باوجود دوسرے صوبوں میں مردم شماری والے ہندوستانی کو گریرسن صاحب کی اصطلاح یعنی مغربی ہندی ھی کے نام سے یاد کئے جاتے ھیں اور زیر تبصرہ رپورٹ میں بھی ھر جگہ یہی نام استعمال ھوا ھے حالانکہ انصاف سے دیکھئے تو ہندوستانی سے بھی بڑھکر اردو ایسا جامع اور موزوں نام ھے جس سے ذھن فوراً ھماری نئی اور مخلوط زبان کی نوعیت کی طرف منتقل ھو جاتا ھے جس کی مشترکیت میں کسی قوم کی تخصیص ھے نہ ملک و مذھب کی—

بہر کیف دوسری بڑی زبانوں کے مقابل اس " مغربی ہندی " کے بولنے والوں کا شمار رپورٹ میں ذیل کے نقشے (صفحہ ۱۹۵) سے دکھایا گیا ھے—

زبان	تعداد اھل زبان	ان کی فیصدی تعداد کل آبادی میں
(۱) مغربی ہندی-اردو	۹ کرور ۹۷ لاکھہ	۳۰٫۵
(۲) بنگلہ	۴ کرور ۹۲ لاکھہ	۱۵٫۵
(۳) تلنگی	۲ کرور ۳۶ لاکھہ	۷٫۵
(۴) مرھٹی	۱ کرور ۸۸ لاکھہ (تقریباً)	۶
(۵) تامل	۱ کرور ۸۸ لاکھہ (تقریباً)	۶
(۶) پنجابی	۱ کرور ۶۲ لاکھہ	۵
(۷) راجستانی یا مارواڑی	۱ کرور ۲۷ لاکھہ	۴
(۸) کنڑی	۱ کرور ۳ لاکھہ	۳٫۵
(۹) اڑیا	۱ کرور ۱ لاکھہ	۳٫۲۵
(۱۰) گجراتی	۹۵ لاکھہ ۵۰ هزار	۳
(۱۱) ملایالم	... ۷۵ لاکھہ (تقریباً)	۲٫۵
(۱۲) لھندا یا مغربی پنجابی	۵۶ لاکھہ ۵۰ هزار	۲
مابقی السنۂ خورد	۳ کرور ۵۰ لاکھہ (تقریباً)	۱۰٫۵

رپورٹ کے نقشے میں سنہ ۱۹۱۱ ع کے اعداد اور اہل زبان کی تعداد میں کمی بیشی بھی دکھائی ہے اور اس کی رو سے اردو بولنے والوں کی تعداد میں ایک فیصدی کا اضافہ ہوا - لیکن یہ اعداد کچھہ زیادہ معتبر نہیں نظر آتے - مثلاً ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دس سال میں لہندا بولنے والوں میں اکھٹا اٹھارہ فیصدي کا اور اہل ملایالم میں دس فیصدی کا اضافہ ہوگیا یا راجستانی والوں کی تعداد بقدر دس فیصدی گھٹ گئی اور اس خلاف قیاس کمی بیشی سے ھی ظاہر ہے کہ یا تو پچھلے اعداد صحیح نہ تھے یا اس مرتبہ اعداد جمع کرنے میں کوئی نیا تغیر ہوا جس کی وجہ سے پہلے نتائج کا مقابلہ کرنا بے سود سا ہوگیا ہے —

اصل یہ ہے کہ اول تو ہندوستان نہایت وسیع ملک یا مجموعۂ ممالک ہے اور یہاں کی آبادی میں مختلف اور متبائن عناصر شامل ہیں - لوگوں کی عام جہالت اور کم فہمی سے شمار کنندوں کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں - دوسرے شمار کنندے بعض اوقات ذاتی تعصبات اور اپنی قومی مصلحتوں کی بنا پر یا محض تساہل و نا اہلی سے صحیح اعداد نہیں درج کرتے - مردم شماری عرصۂ دراز کے بعد ہوتی ہے اور اس کا عملہ ہنگامی طور پر جمع کر کے چند ماہ میں سارا کام ختم اور کام کرنے والوں کو (اکثر بلا معاوضہ) رخصت کر دیا جاتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ شاید سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ مردم شماری کے نقشے میں رفتہ رفتہ اتنے خانے بڑھا دئے گئے ہیں کہ سب کی خانہ پری میں پوری صحت سے کام لینا مشکل ہو گیا ہے - شمار کنندے عام طور پر لوگوں کی جنسیت - مذہب اور عمر کا اندراج کرنے کے بعد باقی خانے سرسری طور پر بھرتے چلے جاتے ہیں —

یہ اسباب ہمارے ہاں کی مردم شماری کے نتائج کو مشتبہ بنانے کے لئے کافی ہیں اور اسی لئے ہمارے خیال میں ضروری ہے کہ تعلیم (خواندگی) اور زبان کا حساب عام مردم شماری سے جدا کر کے ان کے علیحدہ نقشے تیار کرنے کا مستقل انتظام کیا جائے اور اس دلچسپ اور قابل تحقیق امر کے متعلق بھی اعداد فراہم کئے جائیں کہ ہندوستان میں بولنے والوں کے علاوہ ان کی تعداد کتنی ہے جو اردو کو استعمال کرتے یا کم سے کم سمجھہ سکتے ہیں؟

مندرجۂ بالا اعداد سے یہ تو ثابت ہوا کہ ہندوستان کے ان باشندوں کی تعداد جن کی مادری زبان اردو یا ہندوستانی ہے دس کرور کے قریب ہے اور اگر اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لئے جائیں جن کی زبان راجستانی یا مارواڑی دکھائی گئی ہے اور ماہرین لسان اقرار کرتے ہیں کہ یہ بھی محض مغربی ہندی یا اردو کی ایک شاخ ہے تو اردو کے کل اہل زبان گیارہ کرور ہوتے ہیں اور ہماری زبان

دنیا کی سات سب سے بڑی زبانوں میں شمار ہو سکتی ہے *—

سواحل و جزائر افریقہ میں اکثر مقامات پر بازار کی زبان اردو ہے۔ بیرونی ممالک میں جہاں کہیں ہندوستان کے لوگ گئے۔ خواہ ان کی اصلی زبان کچھ ہی ہو۔ باہر اسی ہندوستانی زبان کو بولنے لگے۔ ان سب کی صحیح تعداد کا تخمینہ کرنا قریب قریب محال ہے۔ دوسرے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔ محکمۂ مردم شماری نے تو اتنی دردسری بھی نہیں اٹھائی کہ خود ہندوستان کے اندر "اردو فہمون" کا شمار دریافت کرتا۔ حالانکہ ملک کے اھل الرائے نہایت ممنون ہوں گے اگر اردو یا ہندوستانی کے متعلق اس قسم کے اعداد فراہم کئے جائیں کیونکہ اس براعظم میں قومی اور مشترکہ زبان بننے کی اگر صلاحیت ہے تو وہ اسی اردو زبان میں نظر آتی ہے—

ہمیں یہ تجویز پیش کرنے کی جسارت اس واسطے اور بھی ہوئی کہ ملکی حالات کو دیکھکر بظاہر حکام مردم شماری بھی اردو کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مشترکہ قومی زبان کے مسئلے پر جن خیالات کا اظہار ناظم مردم شماری نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ذیل میں انکا خلاصہ نقل کیا جائے:—

مسٹر مارٹن لکھتے ہیں کہ بول چال اور میل جول کی ضرورتوں نے بعض چھوٹی زبانوں کی بجائے لوگوں کو ملک کی بڑی زبانیں استعمال کرنے پر مجبور کردیا ہے اور ایسے علاقوں میں جہاں مقامی بولیاں بالکل مفقود نہیں ہوئیں۔ وہاں بھی مستقل طور پر کوئی دوسری زبان رائج ہوگئی اور باشندے "ذولسانین" ہوگئے ہیں۔ ادھر گذشتہ دس سال میں تمام ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کے امکان پر بھی بہت کچھ بحث مباحثے ہوتے رہے۔ اعداد سے ظاہر ہے کہ مشرقی اور مغربی ہندی بولنے والوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے اور اگر انہی میں راجستانی اور بہاری کو شامل کرلیا جائے تو ہندی یا ہندوستانی والے شمار میں دس کرور سے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں .... بہ الفاظ دیگر شمالی اور وسطی ہند میں کسی حد تک ایک مشترکہ زبان کا وجود پایا جاتا ہے اور یہی ہندوستان کے حصۂ اعظم کی "لنگوا فرینکا" بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مغربی ہند میں بھی جابجا اس کے ہواخواہ پائے جاتے ہیں اور مثال کے طور پر بڑودہ کے مہتمم مردم شماری نے بعض دکنی ذاتوں کے اس عجیب دستور کا ذکر کیا ہے کہ وہ آپس میں ہندوستانی

---

* بولنے والوں کی کثرت اور علاقوں کی وسعت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبانیں حسب ذیل ہوں گی:—

چینی - انگریزی - اردو - جرمانی - روسی - عربی - ترکی (تاتاری)—

زبان هی میں بات چیت کرتے ھیں-مگر اس زبان کی ادبی صورتیں ھنوز مصنوعی اور لامعیار ھیں کیونکہ ملک میں ایسی کتابیں ھی نہیں لکھی گئیں جنہیں یہاں کی قدرتی زبان کی پیداوار کہا جاسکے-اس بارے میں مسٹرایڈی لکھتے ھیں کہ" زبان دو طریق سے نشوونما پاتی ھے:(۱)عوام الناس میں نئے خیالات کی اشاعت سے اور یا (۲) اھل قلم کی محنت و سعی سے-اب جہاں تک تصانیف کا تعلق ھے-عام لوگوں کی بول چال پر ھندوستانی علم ادب کا کوئی اثرھی نہیں پڑا-کیونکہ یہ علم ادب (جس میں اردو اور ھندی دونوں کتابیں شامل ھیں) جس قدر بھی ھے ایک ساختہ زبان میں ھے اور صرف ان لوگوں کی سمجھہ میں آسکتا ھے جنھوں نے اسے مدارس میں باقاعدہ پڑھا ھو-ھندوستان میں انشاپردازی کی خوبی ھی یہ سمجھی جاتی ھے کہ تحریر میں مغلق اور پیچیدہ الفاظ بھرے ھوں........ ٹکسالی یا معیاری زبان کے بنانے میں نصاب تعلیم کی کتابوں اور سرکاری مطبوعات سے بھی مدد ملتی ھے اور یہ خاصی سادہ زبان میں لکھی جاتی ھیں اور بے شبہ ملک پر کچھہ نہ کچھہ اثر ڈال رھی ھیں-لیکن اس ضمن میں یہ گذارش کئے بغیر نہیں رھا جاتا کہ چند سال سے جو مدرسے کی کتابوں میں صراحتاً اس غرض سے " اعلی ھندی " اور " اعلی اردو " کی عبارتیں داخل کی جانے لگی ھیں کہ طلبہ جرائد کی زبان سے مانوس ھوجائیں- یہ ترقی معکوس ھے-جرائد کو لوگوں کی زبان کا پابند ھونا چاھئے نہ کہ لوگوں کو جرائد کی زبان کا........ باقی اس میں کلام نہیں کہ جرائد کی مدد کے بغیر یکساں زبان کا رواج پانا دشوار ھے اگر چہ یہ کہنا کہ جرائد کا گذشتہ دس سال کے اندر کوئی مفید اثر پڑا فقط حسن ظن نظر آتا ھے * -

مغربی ھندوستان کے متعلق مسٹر مکرجی لکھتے ھیں کہ بودو باش کی ضرورتوں سے دکنی لوگوں نے گجراتی سیکھہ لی ھے اور اکثر اسے بول بھی سکتے ھیں لیکن خود گجراتی لوگ دوسری زبان سیکھنے پر زیادہ مائل نہیں-خاص کر مرھٹی سے مطلق انس نہیں رکھتے-مغربی ھند کے مسلمان عام طور پر اردو بول سکتے ھیں مگر بہت کم ھیں جو اسے لکھنا بھی جانتے ھوں-ھندی تعلیم یافتہ طبقوں میں یقیناً قبول پت رکھتی ھے لیکن اس کا رواج ابھی اتنا عام نہیں کہا جاسکتا جتنا

---

* مسٹر ایڈی کی یہ سب رائیں اگر بجنسہ مان لی جائیں تو بھی اس مسئلہ کا سب سے ضروری پہلو انھوں نے نظر انداز کر دیا اور وہ یہ ھے کہ عام جہالت اور افلاس کے باعث ملک میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ باشندے ایسے ھیں جو کسی اخبار یا کتاب سے خواہ اس کی زبان سہل ھو یا دشوار کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے اور ان کے بول چال پر کسی تحریری زبان کا اثر نہیں پڑسکتا— ھاشمی

انگریزي کا تاهم اسکے " لنگوا فرینکا " بن جانے کے دعوے میں قوت آتی جاتی هے- زبان ثانوي کی حیثیت سے اسے مدارس میں داخل کرنے کی عام خواهش هے اور تعلیم یافته هندو مسلمانوں میں دوستانه روابط بڑھنے کے ساتھه ساتھه هندی اردو کے مناقشے کی شدتیں کم هوگئی هیں- مسلمان فارسیت چھوڑ کر اپنی اردو کو سهل بنا رهے هیں اور هندو سنسکرت پرستی سے جس کا اعلیٰ هندی کی تحریک کے وقت بڑا زور تھا کنارہ کرنے پر مائل نظر آتے هیں......... "

(رپورٹ مردم شاری- باب نهم- فقرہ ۱۶۵)

اگر چه حکام مردم شماری نے اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی مجموعی تعداد معلوم کرنے پر توجه یا " زبان " کے مختصر باب (نهم) میں کوی بحث نهیں کی لیکن هم نے انهی کے فراهم کردہ اعداد کی مدد سے ایک نقشه تیار کیا هے جس سے " اردو فهموں " کے کل تعداد کا اندازہ کیا جا سکے- اس غرض کے لئے ان لوگوں کو بھی اردو سمجھنے والوں میں محسوب کر لیا گیا هے جن کی مادري زبان رپورٹ میں پنجابی- سندھی یا گجراتی دکھائی هے کیونکه اردو سے قریبی لسانی تعلق کے علاوہ ان زبانوں کے بولنے والے کم سے کم اردو کو سمجھه سکتے هیں بلکه غیر زبان والوں سے بالعموم اردو هی میں بات چیت کرتے هیں- یه بالکل ممکن هے که بعض سندھی- گجراتی یا پنجابی دیهات کے باشندے زبان اردو کے سمجھنے سے بھی مطلق عاری هوں لیکن اس کے مقابلے میں خالص بنگالی اور مرهٹی وغیرہ کے علاقوں میں بهت سے مقامات پر اردو فهم پائے جاتے هیں جن کو ذیل کے نقشے میں شمار نهیں کیا گیا اور اس لئے امید هے که همارے مستخرجه نتائج اصلیت سے کچھه بهت بعید نه هوں گے:—

زبان		کل آبادي میں فیصدی تعداد
اردو بولنے والے	مغربی هندی	۶ ء ۳۰
	راجستانی	۰ ء ۴
	پهاڑی	ء ۵
	مشرقی هندي	ء ۴
اردو سمجھنے والے	پنجابی	۱ ء ۵
	گجراتی	۰ ء ۳
	سندھی	۰ ء ۱
اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی میزان		۶ ء ۴۴

اس طرح ہندوستان کی کل آبادی میں کچھ کم ۴۵ فیصدی یعنی تقریباً ۱۴ کرور نفوس زبان اردو کے دائرے میں داخل ہیں-جن میں سے دو تہائی کی مادری زبان اردو ہے اور ایک تہائی اگرچہ دوسری زبانیں بولتے ہیں مگر اردو کو بھی استعمال کرتے یا سمجھ سکتے ہیں —

میں نے ایک اور نقشہ صوبہ‌وار تیار کیا ہے-یعنی ہندوستان کے مختلف علاقوں کی آبادی (کسرات چھوڑ کر) دکھائی ہے اور اس میں مذکورۂ بالا اصول پر اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی فیصدی تعداد پیش کی ہے-رپورٹ کی اصطلاح "مغربی ہندی" کی جگہ اس نقشے میں "اردو" درج کیا ہے-ورنہ سب اعداد رپورٹ مردم شماری کے باب اول (نقشۂ ذیلی نمبر ۳) اور باب نہم (نقشۂ نمبر ۲) سے ماخوذ ہیں—

نام صوبہ	اردو داں	اردو فہم	کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۱-اجمیر (آبادی ۴ لاکھ ۹۵ ہزار)	راجستانی اردو } فیصد ۹۸	...	۹۸ فیصدی	
۲-آسام (۷۹ لاکھ ۹۰ ہزار)	اردو] ۶	...	۶	
۳-بلوچستان (۸ لاکھ)	اردو] ۲	بلوچی سندھی پنجابی } ۴۲	۴۴	
۴-بمبئی (۲ کرور ۶۷ لاکھ ۵۰ ہزار)	اردو] ۵	گجراتی سندھی خاندیسی } ۴۱	۴۶	
۵-بنگالہ (۴ کرور ۷۵ لاکھ)	اردو] ۴	...	۴	
۶-بہار و اڑیسہ (۳ کرور ۷۹ لاکھ ۵۰ ہزار)	اردو] ۶،۶۶	...	۶،۶۶	
۷-بڑودہ (ریاست) (۲۱ لاکھ ۲۶ ہزار)	اردو] ۳	گجراتی] ۸۷	۹۰	

نام صوبہ	اردو داں		اردو فہم		کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۸-پنجاب (۲ کرور ۵۰ لاکھہ)	اردو، راجستانی	۱۷	پنجابی، پہاڑی	۶۵	۸۲	
۹-ترا ونکور (ریاست) (۴۰ لاکھہ)	...		...		...	
۱۰-حیدرآباد (ریاست) (۱ کرور ۲۵ لاکھہ)	اردو، راجستانی	۱۲	مرہٹی*	۲۶	۳۸	* ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو ھے اور عام طور پر یہاں کے باشندے اردو سمجھتے ھیں خاصکر مرہٹ واڑی کے لوگ- لیکن میں نے اس تخمینے میں از رہ احتیاط صرف مرہٹی والوں کو اردو فہموں میں شمار کیا-
۱۱-دھلی (۴ لاکھہ ۸۸ ھزار)	اردو، راجستانی	۹۶	پنجابی وغیرہ	۳	۹۹	
۱۲-ریاست ھاے راجپوتانہ (۹۸ لاکھہ ۴۴ ھزار)	راجستانی، اردو	۹۴،۶	...		۹۴،۶	
۱۳-صوبۂ سرحدی (۵۰ لاکھہ ۷۶ ھزار)	اردو، پنجابی+، راجستانی	۵،۶	مغربی پنجابی+	۴۱	۴۶،۶	+ اس علاقے میں پنجابی کے اھل زبان اردو ھی بولتے ھیں اور مغربی پنجابی والے عام طور پر اردو سمجھتے ھیں-
۱۴-صوبۂ متحدہ (۴ کرور ۶۵ لاکھہ)	اردو	۹۹،۷	...		۹۹،۷	

نام صوبہ	اردو داں	اردو فہم	کل بولنے اور سمجھنے والے	کیفیت
۱۵-صوبۂ متوسط و برار (۱ کرور ۵۹ لاکھ)	اردو، راجستانی ۵۶،۶	---	۵۶،۶	
۱۶-گوالیار (ریاست) (۳۱ لاکھ ۸۶ ہزار)	اردو، راجستانی ۹۷،۶	...	۹۷،۶	
۱۷-کشمیر (ریاست) * (۳۳ لاکھ ۲۰ ہزار)	اردو، راجستانی ۲۵،۵	کشمیری، پنجابی ۶۰	۸۵،۵	* اس ریاست کی بھی سرکاری زبان اردو ھے اور عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ھیں-
۱۸-کوچین (ریاست) (۹ لاکھ ۷۹ ہزار)	...	...	...	
۱۹-مدراس (۴ کرور ۲۸ لاکھ)	اردو ۲،۳	---	۲،۳	
۲۰-میسور (ریاست) (۵۹ لاکھ ۷۸ ہزار)	اردو ۵،۵	...	۵،۵	
۲۱-ریاست ھاے وسط ھند (۶۰ لاکھ)	راجستانی، اردو ۸۵،۲	گجراتی ۱	۸۶،۰	



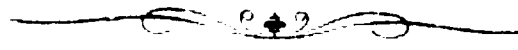
سویڈی ادبیات میں رومان کی حیثیت

از

(جناب مسز صالح حیدری آی-سی-ایس)



(یہ مضمون مسٹر صالح حیدری آی-سی-ایس فرزند اکبر جناب مسٹر محمد اکبر حیدری المخاطب بہ نواب حیدرنواز جنگ بہادر ممبر فنانس کی اہلیۂ محترمہ نے میری درخواست پر اردو کے لئے تحریر فرمایا-خاتون موصوف اعلے درجہ کی تعلیم یافتہ اور ادیب ہیں-سویڈی ان کی مادری زبان ہے-انگریزی اور فرانسیسی کی بڑی عالم اور انشاپرداز ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں-یہ مضمون انہوں نے انگریزی میں لکھہ کر عنایت فرمایا تھا-اس کا طرز بیان پرزور نقادانہ اور ادیبانہ تھا-ترجمہ آسان نہ تھا-لیکن پروفیسر وہاج الدین صاحب (اورنگ آباد کالج) نے اپنی مہربانی سے بہت خوبی سے اس کا ترجمہ کیا ہے — اڈیٹر)



برگسن کا دعوی ہے کہ " حیات عجائبات کے پے در پے ظہور کا نام ہے"- غور کرو تو اس مقولہ میں صداقت نام کو بھی نہیں پائی جاتی-اس کے مقابلہ میں تو فرانسیسیوں کا یہ قول کہیں زیادہ حقیقت پر مبنی ہے " کہ جتنا زیادہ اشیاء میں تغیر ظہور پزیر ہوگا اتنی ہی وہ بالاصل ایک سی نظر آئیں گی-سویڈی ادبیات کا یہی حال ہے-عام یوروپی ادبیات کی طرح اس میں بھی ادبی مذاهب کی بوقلمونی نظر آتی ہے-ہر گروہ دوسرے کی مخالفت میں سرگرم نظر آتا ہے-ہر ایک کی یہی کوشش ہے کہ " نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کردے "—

ہم میں بھی اکثر قدیم اور جدید ادیب ایسے گذرے ہیں جو افلاطون کے خشک مذہب " عقلیت " کے پیرو رہ چکے ہیں-ان میں " شعر کش " شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں اور گندم نمائی اور جو فروشی کرنے والے جھوٹے منطقی بھی موجود ہیں-ان میں بھی کئی والٹیر (Voltaire) پیدا ہوچکے ہیں یا کم از کم والٹیری مذہب کے پیرو جو شیکسپیر پر دائرۂ متانت سے باہر نکلنے کا الزام لگاتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ " ساحرات نظم (Muses) کی حیثیت اس کی (شیکسپیر) نظروں میں کرتب دکھانیوالی نٹنیوں کی سی ہے جو تنے ہوئے رسوں پر ناچتی پھرتی ہیں "—

ان ادیبوں کے مقابلہ میں ہمارے یہاں جدید رومان نگاروں کا ایک ایسا گروہ بھی ہوچکا ہے جو ہر چیز میں والتیر کا ضد تھا-ان لوگوں نے کوشش کرکے فنی تکلف کی ہموار مگر اکتا دینے والی سطح کو جابجا سے اکھاڑ پھینکا ہے اور آزادی کے ساتھہ جذبات وتخیلات کی دلچسپ شوخیوں اور چھلوں پر اتر آئے ہیں- رومانیت کی یہ تحریک چونکہ خود اپنے مقصد سے خبردار نہ تھی اس لئے یہ بہت جلد " بلند پروازی" اور " انیلے پن " کے رنگ میں ڈوب کر رہ گئی-ہمارے ابتدائی رومان نگار " فردوس " کے مناظر کا خواب دیکھا کرتے تھے-ان میں فطری خودرو اور سادگی آمیز غرور و طنیت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا-لیکن پھر بھی وہ حقیقت اور " واقعیت " کی دنیامیں رہتے تھے-برخلاف ان کے ہمارے آتشبازوں یعنی جدید رومانیت کے مقلدوں نے تو سرے ہی سے اس عالم خاکی سے ہاتھہ دھوڈالا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عدم کو اپنا گھر بنا بیٹھے-اس تحریک میں مرکزیت کا ظہور رفتہ رفتہ ہوا ہے اور سنجیدگی اور فنی کمال کی صفتیں جو انیسویں صدی کے سویڈی ادبیات کا طغرائے امتیاز سمجھی جاتی ہیں اس میں بتدریج پیدا ہوئی ہیں—

———:o:———

مثال کے طور پر آسکر لورتین (Oscar Levertin) کو لو-یہ ایک سویڈی یہودی تھا اور دوسری قومی صفات کے دوش بدوش " حزن ویاس " کا بھی بہت کچھہ حصہ اسکی فطرت میں موجود تھا- روکوکونوویلر (Rokoko Noveller) اسی کی ایک ظرافت آمیز اور پر جوش تصنیف ہے اور اس میں شاہ گستاف ثالث کے دربار کی زندگی کا چربہ اتاراگیا ہے- اسکی نظمیں پرجوش دہقانی شاعری کے جواہر ریزے ہیں-ہمارے شمالی شہروں کی طرح جو ایک پر اسرار شفق کی چادر میں لپٹے ہوئے رہتے ہیں اس کا کلام بھی جوش اور ہمدردی کی تابش لے مالا مال ہے- جیسا کہ خود لورتین کا قول ہے "——اس کی نظمیں اس سیاہ ماتمی لباس کی طرح ہیں جس میں ارغوانی رنگ کی سیون جھلکتی ہو"-اپنی ایک نظم "Carence" کا آغاز وہ اس طرح کرتا ہے:—

" آج جشن عید ہے اور عید کا آخری روز
جب کہ ' غم ' کا لباس شہانہ ہے
اور ' عیش ' سیاہ پوش ہے ان
تمام مرے ہوئے لوگوں پر افسوس ہے

جو محبت کرنے کے لئے دوبارہ زندہ
نہ ہوں گے"—

———:o:———

ورنر-و-ھای‌دن‌استیم (Verner V. Hiedenstam) بھی انیسویں ھی صدی کا شاعر ھے-شوق سیر - اور جمال پرستی - یہہ چیزیں اس کے طغرائے امتیاز ھیں- اسی صدی کا ایک اور شاعر گستاف فروڈنگ (Gustaff Froding) ھے-جس کی عجیب و غریب خصوصیت "انفرادیت" ھے- وہ فضا جس پر انیسویں صدی کے آخری ربع میں کہر اور ظلمت مسلط ہوچکی تھی اسی کے تازہ و باکمال کلام سے منور ھوئی-اس نے ترانوں سے اپنے ہم عصر ادبی اور سماجی نقادوں کے کان کھڑے کئے اور یہہ کچھہ اس انداز سے بلند ھوئے کہ ان کی بلند آھنگی ان حضرات کو پسند نہ آسکی-کہتا ھے:—

" نئے اور برق صفت خیالات آن پہنچے-ان سے
ھر کونے میں جگمگاھٹ اور اجالا پیدا ھوگیا-
پرانی اور فرسودہ شمعوں نے آواز بلند کی
گھر میں آگ لگ گئی ھے اسے بجھاؤ بجھاؤ !
ڈھونکیاں استعمال کرو......گلگیر کو طاق پر رکھدو"

———:o:———

غالباً یہ کہنا بیجا نہ ھوگا کہ ھماری رومانی تحریک کی سب سے زیادہ باکمال اور فنی اعتبار سے بہترین مظہر مس سیلم لاگرلوت کی وہ تصنیف ھے جو"گوستا برلنگ کی داستان" کے نام سے مشہور ھے-یہ داستان جیوٹ اور بہادری کے قصوں کا ایک سلسلہ ھے-تخیل کی بھینی بوباس کو ذرا زیادہ تیز کرنے کی غرض سے کہیں کہیں ھیبت اور خوف کی آمیزش بھی کردی گئی ھے- بے فکری کے قہقہے بھی ھیں-گوستا برلنگ کتاب کا ھیرو ھے جو نیم شاعر اور نیم رند ھے-یہ غوغائیوں اور رنگیلوں کی ایک بڑی جماعت کو لے کر اٹھتا ھے اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی بے باکانہ جسارتوں کا ڈنکا بجوا دیتا ھے-ان قصوں میں ھم کو اس زمانے کی بولتی چلتی تصویریں نظر آتی ھیں جب بے فکری اور عیش و عشرت کا راج تھا اور"بانکوں" کے لئے کھانے کی میز سے اٹھکر سیدھے کمرۂ عدالت کا رخ کرنا اور ناچ کی محفلوں سے اٹھکر شراب کی گرما گرم مجلسوں میں شریک ھونا ایک معمولی سی بات تھی-یہ سب قصے اس وقت کے ھیں جب خلیج ریمن کے کنارے مستقلاً رنگ رلیوں اور رقص و سرود کے لئے وقف تھے—

———:o:———

مس لاگرلوف کا اسلوب بیان انوکھا اور دلکش ہے- لیکن افسوس ہے کہ بعد کی تصنیفات میں یہ رنگ کسی قدر پھیکا پڑ گیا ہے- بلکہ کہیں کہیں تو اس نے تصنع اور آورد کی شکل اختیار کرلی ہے- پھر بھی گوستا برلنگ کی داستان بھولنے والی چیز نہیں اور جہاں کہیں بھی سویڈی اور رومان کا ذوق رکھنے والے موجود ہوں گے اس کتاب کا مطالعہ اور اس کی وقعت برقرار رہے گی- تنقید نگاروں اور عوام کے حلقہ میں اس کتاب نے جو ہردلعزیزی حاصل کی اس کا کچھ اندزہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ شائع ہوتے ہی اس کتاب کی بدولت (وریہ مس لاگرلوف کی پہلی تصنیف ہے) مصنفہ کو نوبل پرائز کا مستحق سمجھا گیا—

اس کے بعد کارل ایرک فارسلینڈ کا نام آتا ہے- اس مصنف کو ہم جائز طور پر اپنا جدید روسو (Rousseau) کہہ سکتے ہیں- اس کا راگ دیہاتی فضا کی دلکشیوں سے لبریز ہوتا ہے- سفید تختہ بندی کیا ہوا سرخ رنگ کا جھونپڑا- گرد و پیش کے مرغزار- دھوپ میں پھریرے لیتا ہوا سفید جھنڈا- ہری ہری دوب پر مزے مزے سے چرتی ہوئی چتکبرے رنگ کی گائیں- یہ اور ایسی ہی چیزیں اس کے راگوں کا موضوع ہیں- وہ ان ہی چیزوں کے متعلق الاپتا ہے اور کچھ ایسے لگتے ہوئے میٹھے سروں میں الاپتا ہے کہ ہمارے شہری ان سے متاثر ہوکر ہر سال موسم بہار میں گروہ در گروہ دیہاتی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہیں اور جب یہ لوگ واپس آکر قہوہ خانوں- جگمگاتی ہوئی دوکانوں- مختصر یہ کہ تہذیب و تمدن کی جملہ آسائشوں سے دو چار ہوتے ہیں تو اطمینان کی سانس لیتے ہیں:—

"جب شاعر کی چشم بصیرت کھلتی ہے تو اسے بیری
کی جھاڑیوں پر نظمیں لٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں
جب شکسپیر کا گزر ہوتا ہے تو پورا بازار کا
بازار سوانگ بھرنے لگتا ہے"—

———:o:———

حریف ادبی مذاہب اور جھگڑتے ہوئے عامی حلقوں کی خیرہ کن روشنی سے دو چار ہو کر ہماری نگاہیں اکثر ایک حقیقت کو نظر انداز کر دیا کرتی ہیں اور وہ حقیقت "قومی روح" ہے- دیر ہو یا سویر- کبھی نہ کبھی ہر قوم اپنی ہستی سے ضرور خبردار ہوتی ہے- سنساری (Cosmopolitan) اثرات اپنا عمل ضرور کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ چیزیں منظر عام سے غائب ہوتی جاتی ہیں اور غیر ملکی اثرات کی کورانہ کشمکش کے پیچھے سے ایک نئی شخصیت نمودار ہوتی ہے اور بتدریج اپنے خمیر اور اپنی مخفی خواہشات سے خبردار ہوتی جاتی ہے- اخلاقی اور فنی نقطۂ نگاہ سے اگر قومیت کا یہ ظہور ایسے زمانے میں ہوا ہو جو ذہنی جد و جہد کا

زمانہ ہو تو قومی مزاج پر بھی اس کا اثر ضرور پڑتا ہے اور ''ضبط خودی'' اور ٹھنڈے دل سے استدلال کرنے کی صفات جو تمام قدیم ادبیات کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔اس میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔چنانچہ فرانس میں یہ ہی ہوا۔ فرانسیسی ادب کی دیوی انقلابات و تغیرات کے باوجود اب بھی ''ملکہ'' بنی ہوئی ہے۔لطافت کی جھلک اور منطق کا ناقابل محو شائبہ اس میں آج تک برقرار ہے۔ انگلستان میں ''قومی آنا'' کی تشکیل ایسے وقت ہوئی جب جذبات کے دریا جوش مار رہے تھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک انگریزی ادبیات کی ایک اپنی خصوصیت باقی چلی آتی ہے —

——:o:——

اگر اسی خیال کو استعارہ کی زبان سے سننا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ انگلستان میں ''ادب کی دیوی'' ایک مرتبہ چمکی اور قومی شعور سے اس طرح ابھری جیسے کہ یونانی دیومالا میں می نروا (Minerva) قدیم دیوتا کے اندر سے ظاہر ہوئی تھی۔لیکن ہماری سویڈی ادب کی دیوی کا جنم اس سے مختلف طریقہ پر ہوا۔اس کی آمد بوق و قرنا کے شور اور جھانجھوں کی جھنکار میں نہیں ہوئی وہ ایک حسین بچہ کی طرح جھجکتی ہوئی اور غیر ملکی رطب و یابس میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ ڈھونڈھتی ہوئی ظاہر ہوئی۔اس کی پیشانی پر الجھن کے آثار تھے اس کی نیم وا اور دھندلی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب تک بہشتی نظاروں کی یاد میں مشغول ہے —

اسنائل سکی (Snoilsky) نے ایک نظم ''اولڈ کنگ گوستا'' لکھی ہے۔ (گستاف واسا ہمارا سب سے پہلا جدید شاہنشاہ اور سیاسی نجات دہندہ ہے)۔اس نظم میں شاعر نے اس حسرت بھری آرزو کی تصویر کھینچی ہے جو ہماری دیوی کے دل میں جوش مار رہی ہے کہ وہ کسی طرح گائے اور دل کا بخار نکالے:—

> ''دروازے بند تھے اور باہر ہزارہا آدمیوں کے دل انتظار میں دھڑک رہے تھے۔جاڑے کی رات میں ایک پوری قوم باہر منتظر کھڑی تھی—— اسکی مشکور اور احسان مند قوم جس کو اس نے نجات دلائی تھی یعنی اس کے سویڈی جن کے سینوں سے آواز تک نہ نکل سکتی تھی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنی ضرورتوں کو اس پر ظاہر کریں——''

——:o:——

''ان کا راگ ان کی بہترین نذر اب تک مقید تھا۔

اس کے میٹھے بول ابھی تک 'زبان' کے قالب میں مصروف خواب تھے۔اس کو آرام اور تسکین دینے کے لئے تو یہہ راگ لطیف ترین نغموں کی شکل میں بہہ نکلتا لیکن چھلکتے ہوئے دل سے صرف ایک لکنت زدہ آواز نکلی"—

———:o:———

"وہ وقت تھا اور آج کا دن اس مدت میں ہمارے ساز میں کئی زریں تاروں کا اضافہ ہوا اور مقدس انگلیوں نے ان کو چھیڑ کر تمام مملکت کو نغموں سے معمور کیا ناآشنائے کمال انگلیوں سے مس ہوکر یہ تار اب بھی لرزتے ہیں۔میری پیاری سویڈی زبان! اب تو گا سکتی ہے!"

———:o:———

انگلستان کی طرح ہماری سویڈی ادب کی دیوی نے جس زمانے میں کلکاریاں بھریں اور تتلا تتلا کر بولنا شروع کیا وہ وہ زمانہ تھا جب وجدان کا دور دورہ تھا اور صحیفۂ قومی کے اوراق پر تخیل جولانیوں میں مصروف تھا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے جتنے شعرا حقیقی معنوں میں قومی شاعر کہے جاسکتے ہیں وہ سب کے سب بدرجۂ اولی رومانی (Romanticists) بھی تھے۔ان لوگوں نے ہمیشہ حریف اور مصروف پیکار "مذاہب" کی کشمکش سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے اور دونوں فریقوں کی بہترین صفات کو جذب کرکے اپنی ذاتی ذہانت سے اس کے عجیب و غریب نمونے تیار کرتے رہے ہیں۔اشیائے حیات ان کی نظروں میں حقیقی اور اصلی تھیں۔محض ایک خیالی بہشت کے پر فریب تصور میں آکر ان لوگوں نے حقیقت کو ہات سے دینا کبھی گوارا نہیں کیا۔ہاں یہ بے شک ہوا کہ گیٹی (Goethe) کی طرح کبھی کبھی ان لوگوں نے بھی "پستئ حقیقت" سے اڑکر تخیلات کی زریں فضا میں پرواز کرنا ضروری خیال کیا ہے—

ان لوگوں نے سراب صفت خواہشوں کو کبھی اپنی جستجو کا انجام نہیں قرار دیا اور نہ ان کی تگ و پو کبھی ان کو بے سراغ سمندروں اور نا معلوم کناروں تک لے گئی۔ان سب کی جستجو نے ایک خاص شکل اختیار کی اور اپنا ایک خاص مقصد مقرر کیا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شعرا مثلاً اولاس پٹری۔تگنر۔وکٹر رڈبرگ۔زے کیریس توپی لی یس وغیرہ ہمارے سچے مصلح بھی ہوئے ہیں۔ظاہری اور

باطنی دونوں طریقوں سے ان لوگوں نے قوم کی رهنمائی کی هے اور دراصل یهی لوگ همارى قومی روح کی تشکیل اور تعئین کرنے والے هوئے هیں—

———:O:———

همارے روحانی مقتداؤں میں سب سے زیادہ محبت کے قابل وکٹررڈبرگ کی ذات تهی اوراب بهی هے-سنه ۱۸۷۷ ع میں الپسالا یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر اس نے ایک نظم "Kantata" لکهی هے اور اپنی رجائیه تصوریت کا (Idealsim) ایک عجیب موثر اور پائدار طریقه پر اظهار کیا هے-میرا منظوم ترجمه اصل کے مقابلے میں نقل کی حیثیت رکهتا هے لیکن اظهار مطلب کے لئے چونکه کوئی اور وسیله نهیں هے-اس لئے اسی کو غنیمت جانکر درج کیا جاتا هے:—

"سنین ماضیه کی تاریک رات میں هوکر مختلف منزلوں
سے گزرتی هوئی-اے انسانیت تو ایک نا معلوم منزل
مقصود کی طرف لڑکهڑاتے هوئے قدموں سے بڑه رهی هے"—

———:O:———

"جس کو تم روز روشن سمجهے هوئے هو-وه صرف ایک پهیکی
اور بهکتتی هوئی روشنی کی جهلک هے-اس کے آگے
آگے اس سے بهی زیاده دهندلی کهر هے اور تمهارے
پیچهے تاریک رات هے!"

اس کے بعد چند بهترین اشعار هیں جنهیں هات لگانے کی همت میں نهیں کرسکتی-ان اشعار میں شاعر بنی نوع انسان کو لق ودق بیابان میں کوسوں تک لے جاتا هے-قدم قدم پر غشی هے-چپه چپه پر دهڑکتے هوئے دل سے سوال نکلتا هے:—

"اے خدائے بزرگ و برتر! تو هم کو کهاں لئے جا رها هے
آسمان پر نظر دوڑاؤ-تم دیکهو گے-که هزارها آفتاب
غائب هوتے جاتے هیں-کتنی 'گشت هائے انجم' کٹتی چلی جاتی
هیں-دنیاوی نظام رو به فنا هیں-آوازیں آتی هیں که جو
کچهه هے بے بقا هے جسے تم 'زمان' کهتے هو اس کی
حیثیت محض ایک درمیانی اور وسیع قید خانے کی سی هے"-

———:O:———

"یه سب کچهه هے لیکن مایوس هوکر گر نه پڑنا! اپنی تلاش
کو ختم نه کر دینا!! جهنڈے کو مضبوط پکڑ لو اور یه امید
لئے هوئے بڑهے چلو که جو کچهه تم نے حق خیال کیا-جو کچهه تم نے

پیار و محبت سے کیا ان خوشگوار خوابوں پر 'زمان' کی دسترس نہیں ہو سکتی - یہ چیزیں تو تمہارے لئے مزرع اخرت و ابدیت ہیں "—

———:o:———

" ہے وہ روح جو شرافت اور صداقت کے شوق میں گھلتی رہتی ہے اس کی تہ میں ابدیت اعلی کا شعلہ رقص کرتا رہتا ہے خود غرضی چھوڑ دو تو وہ عکس الہی جو تمہاری روح میں ہے نسلاً بعد نسلاً روز افزوں 'کمال' حاصل کرتا رہیگا-صحرا نوردی میں کتنی ہی مدت کیوں نہ گزرے انجام میں تم 'کنعان' ضرور پہنچ جاؤ گے "—

———:o:———

زے کیریس توپی لی یس کہتا ہے :—

" نغمہ کی تخلیق 'غم' سے ہوئی اور 'غم'
ہی سے 'عیش' دریافت کیا گیا "—

حزن و ملال کا جو گہرا رنگ اس شعر میں جھلکتا ہے وہ ہمیشہ ہمارے قومی مزاج کو راس آیا ہے - ہمارے شاعروں میں تگنر نے اس " جہنمی تاریکی " کی مخالفت میں اپنی آواز بلند کی - اس نے کہا کہ " سچے سویڈوں کو یہ زیبا نہیں ہے - ہماری قومی زبان مردانہ ہے اس میں ہائے - وائے - دریغا - حسرتا وغیرہ کی گنجائش نہیں ہے شاعرانہ الہام کا اعلی ترین ماخذ غم و اندوہ نہیں بلکہ انبساط و سرور ہے " - لیکن خود تگنر نے تاریک ترین حزنیہ نظمیں لکھیں اور اپنے منہ سے اپنی تکذیب کی !!

اگر ہم اپنی شاعری کے اولیں اور خودرو نمونوں کو ٹٹولیں یعنی اپنی دہقانی شاعری اور عام گیتوں پر نظر ڈالیں تو عملاً ہمیں ان میں سے ہر ایک میں حزن و یاس - اندوہ و الم کا نغمہ سنائی دے گا - کہیں موت اور بے رحمانہ قتل کی تصویر کھنچتی ہوئی نظر آئیگی - کہیں ایسے بچوں کا تذکرہ ہم کو ملے گا جو خون کے آنسو روتے تھے - ایک قصہ (Sven in the Rosegarden) ہے - اس میں ہیرو اپنے بھائی کو قتل کرتا اور اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ وہ اس وقت تک واپس نہ آئے گا " جب تک ہنس راج سیاہ رنگ کے نہ ہو جائیں اور پتھر بہنا نہ شروع کریں "—

———:o:———

" تقابلی ادبیات " کے مطالعہ میں ہمیشہ ملکی اور قومی اثرات کے بجاے بین قومی اور سنبساری اثرات کو زیادہ وقعت دی جاتی ہے - اس میں شک نہیں کہ مغربی ممالک مین جو ادبی ارتقاء ہوا ہے اور اس میں جو کچھ یکسانی پائی

جاتی ھے اس کی توجیه انہی سنسار ی اثرات سے ھوتی ھے - لیکن پھر بھی کیا یه خیال
کرنا بعید از عقل ھے که ھر قوم اپنی کچھه " ذاتی گہرائیاں " بھی رکھتی ھے اور
ان گہرائیوں کے اندر اس کی مشترکه روح کو تشکیل دینے والا مواد بھی موجود
رھا کرتا ھے! اسی طرح سے میرا خیال ھے که " تصوف " اصلاً اور ابداً ھمارے قومی خمیر
میں سرایت کر گیا ھے اور ھمیں تصوف اور تقویٰ کی تلقین کے لئے روسیوں کی
ضرورت نہیں ھے حالانکه وہ وقتاً فوقتاً اس کا دعویٰ کرتے رھتے ھیں - ھم میں
عجائبات قدرت کا احساس اور تقویٰ پیدا ھو جانے کی دو وجہیں ھیں - ایک تو یه
که ھمارے ملک میں انسان کو بے تعداد حوادث سے مقابل ھونا پڑا اور دوسری
بات یه که اسے اپنے سے کہیں زیادہ زبردست طبعی قوتوں کے آگے سر تسلیم خم
کرنا پڑا - مثال کے طور پر ان لکڑی کاٹنے والوں کو لو - جو ھمارے جنگلوں میں کام
کرتے رھتے ھیں - لنبے لنبے شہتیروں پر سیدھے کھڑے ھو کر وہ اپنی اس حقیر
ناؤ کو تیز رو پہاڑی نالوں کے دھارے پر ڈال دیتے ھیں - کوئی بے ڈول حرکت
ھو جائے یا اندازہ میں ذرا سی بھی غلطی ھو تو تباھی کے منه میں گر پڑنا ان کے
لئے یقینی ھے - لیکن یه لوگ برابر صبر و خاموشی کے ساتھه اپنی روزانه مشقتوں
میں مشغول رھتے ھیں اور بہادری کے ساتھه موت سے کھیلتے رھتے ھیں - یا پھر
ھمارے ان دھقانوں کی حالت پر غور کرو جو بحر منجمد شمالی کے نزدیک مرتفع
سطحوں اور پہاڑوں کے ڈھلان پر رھتے ھیں جہاں گرمیوں بھر سورج نہیں چھپتا
اور سردیوں میں به مشکل افق کے اوپر دکھائی دیتا ھے - گرمیوں میں ان میدانوں پر
شفق کی گلابی چادر پھیل جاتی ھے اور سردیوں میں زمین پر کئی کئی فیٹ گہری
برف نظر آتی ھے - راستے بند ھو جاتے ھیں اور غریب کسان اپنے جھونپڑوں میں حبس
کی وجه سے مر جاتے ھیں - جہاں جاڑوں کا یه مطلب ھوتا ھے که بچارے کسان مہینوں
جبریه بے کاری اور کاھلی کی حالت میں پڑے رھتے ھیں - جہاں بھیڑیا نادار کسان
کی اکیلی گائے کو بھی باقی نہیں چھوڑتا اور صرف ایک رات میں پالا اس کی
فصلوں کو تباہ کر ڈالتا ھے - ظاھر ھے که ان صورتوں میں انسان فطرت کو صرف
خوشگوار یا غیر خوشگوار منظر ھی کی حیثیت سے نہیں جانتا - اسے وہ اپنا دوست
اور شریک کار نہیں سمجھتا اس کی نظروں میں وہ ایک سخت گیر اور ناقابل
فتح دشمن ھے جو اکثر پرخاش پر آمادہ نظر آتا ھے - مختصر یه که وہ فطرت کو ایک
ایسی دیوی تصور کرتا ھے جس کی پرستش لرزتے ھوئے جسم اور دھڑکتے ھوئے دل
سے کرنا چاھئے - یه لوگ شگون کے انتظار میں اس کے چہرے کو تکتے رھتے ھیں که
آیا اس کا منشاء زندگی ھے یا تباھی - نئی امید ھے یا قطعاً مایوسی! ان کی نگاہ میں
فطرت مردہ نہیں ھے - انہیں وہ ذریات کی ایک کثیر جماعت کے ساتھه دکھائی دیتی ھے

جو اسی کی طرح کبھی اچھے۔کبھی برے۔کبھی ملتفت بہ دوستی اور کبھی مائل بہ تباھی ھو جاتے ھیں—

———:o:———

یہی وہ حد ھے جہاں ھمارے ھمہ اوست کے عقیدہ اور ھمارے صوفیانہ خیالات کا آغاز ھوتا ھے۔یہی وہ نازک مقام ھے جہاں کم فہم لوگ شراب کا شکار ھو جاتے ھیں اور مذھبی "موجدوں" کے پھندے میں گرفتار ھو جاتے ھیں۔اس کی وجہ صرف یہ ھے کہ شراب کی مجلسوں اور مذھبی جوش میں خوف زدہ انسانیت کو روزانہ آلام زندگی سے کسی قدر سکون نظر آتا ھے—

———:o:———

ازمنۂ وسطیٰ کا جب خاتمہ ھوا تو ھماری "رومانیت" میں ایک عجیب بے تکا پن پیدا ھو گیا تھا اور ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کا اعلیٰ ترین مظہر سینٹ بری گیتا کی کتاب "تجلیات" "Revelations" ھے۔یہ خاتون ھمیشہ حضرت مسیح کے خیال میں رھتی تھی۔ان کو یہ اپنا شوھر سمجھتی تھی۔اولیا کے ساتھ بھی اس کو توسل تھا۔ان مقدس ھستیوں کا بیان ایسے درخشاں الفاظ میں کیا گیا ھے جو تصوفانہ تخیل سے منوّر ھیں۔فقدان تربیت کے باوجود ان "تجلیات" میں رقت اور درد و سوز کی عجیب و غریب کیفیت پائی جاتی ھے۔ھر جملے کی تہ میں ایک عجیب و غریب شخصیت کا نقش گہرا کھدا ھوا نظر آتا ھے۔ھر لفظ بجائے خود ایک ایسے پیغام کی حیثیت رکھتا ھے جو کسی دھڑکتے ھوئے دل سے تڑپ کر نکلا ھو یعنی ایک ایسے دل کا پیغام جس کے جذبات کا تلاطم انسانی ضبط و برداشت سے باھر ھے اور جس کو صرف ریاضت نفس اور انکسار و تواضع کی شدتوں ھی میں آرام و سکون کی شکل نظر آتی ھے۔اس کتاب میں ھمیں "طبیعیت" (Naturalism) اپنی لفظی حیثیت میں نظر آتی ھے۔اس کے علاوہ استعارات کی ایک ایسی پھلجھڑی چھوٹتی ھوئی نظر آتی ھے جو اپنی تصور آفرینی اور جذبات انگیزی میں ھرگز کسی جدید سے جدید ترین لفظی تصویر کے مقابلے میں حقیر نہیں کہی جا سکتی—

———:o:———

امانوئل سویڈن برگ نے اپنے تصوفانہ معتقدات کو ایک روحانی مذھب کی شکل میں منتظم کرنے کی کوشش کی ھے۔اس کے متعلق عام اعتقاد یہہ تھا کہ وہ ملائکہ سے ھمکلامی کیا کرتا ھے! ان کو وہ انسانوں کا روحانی مقتدا خیال کرتا تھا

برخلاف اس کی دوسرا گروہ اسے صرف ایک سفاکی ساحر اور پراسرار عملیات کا ماہر جانتا تھا۔آج اس کا نام تمام دنیا میں مشہور ہے اور معرفت الٰہی کی جدید شاخ "تھیاسوفی" کے عقیدت مند اسے اپنا زبردست ترین نبی مانتے ہیں—

———:0:———

اتولف جونس سب سے پہلے گذشتہ جنگ کے زمانہ میں منظر عام پر آیا۔اس نے "رتھیدس" کے نام سے ایک افسانہ لکھا ہے اور اس چیز نے اسے بات کی بات میں معمولی شعرا کی سطح سے کہیں زیادہ بلند کردیا۔بیسویں صدی میں ادبیات کی جو "دیوانی ھاندی" تیار کی گئی ہے اُس کے مقابلہ میں اگر اس کتاب کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس میں بلند پایہ رومانیت کو نہایت دلکش اور انوکھے پیرایہ میں نباھا گیا ہے۔"وراثت" تمام افسانہ نگاروں کا قدیم ترین اور عزیز ترین موضوع ہے۔اسی بنیاد پر جونس نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ایک افسانہ تیار کیا ہے۔تاریک اور ڈراونے جنگلوں کی "زمین" پر تصوفانہ واقعات کی گلکاری کی گئی ہے۔اس جنگل میں اگر جاؤ تو کہیں کسی مقام پر انگارہ جیسی آنکھوں والا بن بلاو بیٹھا نظر آتا ہے۔کہیں صبا رفتار سفید رنگ کا بارہ سنگھا تڑپ کر نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور صرف نازک موقعوں پر "برگزیدہ" شخصیتوں ھی کو نظر آسکتا ہے۔اس رزمیہ (Epic) میں جو خیالی ہونے کے باوجود حقیقت آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے دشت و جبل کی تصویر نظر آتی ہے۔ہماری نوآبادیات کے منچلے اور تقدیر پرست نوجوان اس میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔مختصر یہہ کہ اس میں ان تمام مرعوب کن قوتوں کا ذکر ہے جو انسانی ذھن میں جنم لیتی ہیں اور آخر میں انسان کی مختصر سی زندگی کو سنوارتی یا بگاڑتی ہیں—

———:0:———

نہیں! ہم نے رر سیوں سے ھرگز تصوف نہیں سیکھا اور نہ ھمیں اسکی ضرورت ہے کہ بائرن ھمیں ملحدانہ جبر و استیصال کا فلسفہ سکھائے کہ کاغذ پر معاشری عمارت کس طرح ڈھائی جاتی ہے اور اس کے کھنڈروں پر اپنے نفوس کے اداس مجسموں کو کیونکر قائم کیا جاتا ہے! بائرن سے پہلے اور نیز اس کے بعد بھی ھماری ادبیات میں "انا" کی قسم کے بہت سے ھیرو گزرچکے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی شاندار تکلفات میں برباد کردی اور پریشان کن خیالات سے بھاگ کر "منچلے کارناموں" کے دامن میں پناہ لی۔ "ھینس اے لی نی یس" اسی قماش کا ھیرو ہے اور گستاف فروڈنگ کے "شاعر-بانکے" بھی اسی قسم کے ھیرو ہیں۔کیا یہہ مقام

تعجب نہیں کہ اس قسم کے ادبی رجحان کے باوجود نطشے (Neitzsche) کو ہمارے ملک میں زیادہ تعداد میں مقلد نہ میسر آسکے؟ شاید اس کی وجہ یہہ ہو کہ جس چیز کو نطشے منتظم حیثیت میں پیش کرکے فلسفیانہ وقعت دینا چاہتا تھا وہ ہمارے یہاں محض ایک شاعرانہ "اپچ" یا پھر "رومانی رجعت" کی حیثیت رکھتی تھی اور جب ہم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تھے تو خود شرمندہ ہوجاتے تھے —

—:o:—

بائرن اور روسیوں کی ضرورت سے خواہ ہم بے نیاز رہے ہوں۔ لیکن ابسن کی ضرورت ہمیں بے شک رہی ہے اور یہہ اس لئے کہ ہماری مبہم اور باغی "ذہنی پروازیں" ایک مستقل شکل میں ظاہر ہوسکیں۔ اس نے ہمارے جذبی مسائل کو کچھہ اس انداز سے حل کر دکھایا کہ ہم خود نہ کرسکتے تھے اور نہ کسی اور نے کیا۔ پھر بھی معموں کا جو حل اس نے ہم کو بتایا وہ اگرچہ کہیں کہیں پر ٹھیک اترتا ہے جیسے Peer Gynt میں۔ لیکن اکثر اوقات (کم از کم مجھے) غلط نظر آتا ہے۔ اس کی مثال اس کی کتاب Doll's House گڑیاخانہ ہے۔ جس چیز کو وہ لیتا ہے اسے وہ حل کی حد تک لے جاتا ہے لیکن وہاں اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی نقطۂ نگاہ سے یہہ چیز ضرور قابل تعریف ہے لیکن اکثر اس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ ناظرین جتنے آغاز میں حیرت زدہ نہ تھے اتنے خاتمہ پر رہ جاتے ہیں!

ہم لوگ "فرانسیسی طبیعیت * " "Le mal de Siecb-(Naturalism)" (موجودہ صدی کے عیوب) اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ گویا کہ مذہب طبیعیت محض فرانسیسیوں کی دریافت کی بدولت وجود میں آیا یا عیوب صدی صرف اسی قوم کا حق ہے! غالباً یہی وجہ ہے کہ بلزاک اور فلوبرٹ اور اسی مذہب کے دوسرے مصنفین کا مطالعہ ہمارے ملک میں بہت انہماک کے ساتھہ کیا گیا اور ہمارے مصنفین نے بعض اوقات اپنی فطرت اور تجربے کے خلاف اس کی تقلید کی۔ (Strindenberg) اسٹرن دن برگ کی طرح ہمارے کچھہ مصنفین ایسے بھی ہوئے ہیں جو ان خیالات کو اپنی فطرت میں لئے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہہ شخص بہت ذکی الحس تھا۔ اس کا باپ ایک سیول ملازم اور اس کی ماں ایک ادنیٰ درجہ کی ملازمہ تھی۔ اس کی تربیت و پرورش نے زندگی کی ادنیٰ اور پست سطح کا نقش اس کی طبیعت پر کچھہ ایسا گہرا بٹھایا کہ وہ اپنی تمام عمر کے لئے آدم بیزار بن گیا اور

---

* یہ عقیدہ کہ ہر کام طبیعی علل ومعلول کے سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے کوئی چیز مافوق الفطرت یا ایسی نہیں ہے جس کی توجیہ طبیعی اسباب سے نہ کی جاسکتی ہو۔ مترجم۔

آدم بیزار بھی ایسا جو بقول تسکن شاعر اے ری ٹی نو کے ”سوائے خدا کے سب کو برا بھلا کہتا رہا اور خدا کو بھی محض اس عذر پر کچھ نہ کہا کہ ’ میں اسے جانتا ھی نہیں‘ !“—

اپنی ناول Inferno (انفرنو) میں وہ کہتا ھے :—

” میں نے اوائل عمر سے خدا کی تلاش کی۔لیکن مجھے شیطان ملا
میں نے (حضرت) عیسیٰ کی صلیب کو لڑکپن میں اٹھایا
اور میں نے اس خدا سے انکار کیا جو ایسے غلاموں پر
حکومت کرتا ھے جنہیں اپنے ایذا دینے والے سے محبت ھے“—

———:o:———

اس کا قول تھا کہ ” میں تنہا ھوں “ اور آخر تک اس نے اپنے مصائب کو تنہا برداشت کیا۔کہتا ھے :—

” مجھے ندامت و پشیمانی کا کیا حق ھے ؟ اپنی قسمت پر
مجھے اختیار نہیں رھا ھے ۔ میں نے شر کو کبھی شر
سمجھکر استعمال نہیں کیا بلکہ محض ذاتی حفاظت میں
پچھتانا گویا رب کی نکتہ
چینی کرنا ھے جس نے گناھوں کو ھمارے لئے بطور
عقوبت کے مقرر کیا ھے تا کہ وہ کیفیت تنفر
جو برے افعال کرنے سے ھوتی ھے ھمیں پاک و صاف کردے۔“

———:o:———

اس کی خامیوں کا یہ استعداد اگرچہ اس کو بری نہیں کرتا لیکن کم از کم اس کے نقطۂ خیال کی اس سے تشریح ھو جاتی ھے۔ تلاش حقیقت کا عشق اسے جنون کی حد تک لے گیا۔اس کی وجہ سے اسے عجیب و غریب راستے طے کرنا پڑے۔وہ جنت کو تلاش کرتا ھوا دوزخ کے راستہ سے گزرا۔اس ” سفر “ میں جو کچھہ واردات قلبی اس پر طاری ھوئیں۔انھیں وہ کھل کر بیان کرتا ھے۔اس کے اس بیان کو محض تصنع مت سمجھو۔ اس سے اس کی ایک عجیب و غریب خواھش کا پتہ چلتا ھے کہ پہلو کو چیر کر وہ اپنا خون آلود دل نکالے اور دنیا کو دکھا دکھا کر اس کی برائیاں کرے۔ اس کے ساتھہ ھی ساتھہ وہ دنیا سے ڈرتا بھی ھے اور اس سے نفرت بھی کرتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ اس کی تصنیفات پڑھنے کے بعد ھم میں ایک عجیب و غریب بد مزگی پیدا ھو جاتی ھے۔اس بد مزگی کو وہ گناھوں کا توڑ اور مصلح مانتا ھے۔لیکن کیا اس

طرح سے اس کی عجیب و غریب طبعیت کے تاریک رخ کو ٹٹولنا بعید از انصاف نہیں ھے؟ احسانمندی کے جذبات کے ساتھہ اس نور کی یاد ابھی تک میرے ذھن میں محفوظ ھے جو اس کے بیسیوں افسانوں اور ڈراموں میں صاف جھلکتا ھے۔اس کا خیالی ناٹک "Swanwhite"-اس کی کتاب "Kronbruden" اس کے تاریخی ناٹک- یہ سب اسی قسم کی تصنیفات ھیں—

———:o:———

مصائب و آلام میں پڑکر بھی وہ اپنی ناقابل تسخیر امید پر بھروسہ کرتا رھا-وہ برابر ھاتھہ پھیلا پھیلا کر "ابدی چھلاوہ" کو پکڑنے کی کوشش کرتا رھا- انجام یہ ھوا کہ اسے خود اپنے شکوک میں بھی شک پیدا ھوگیا-ایذاے نفس اور مصائب کی دلدل میں ایک عرصہ تک ھاتھہ پاؤں مارنے کے بعد-آخرکار اسے ایک چٹان نظر آئی جہاں وہ بیٹھہ کر آرام لے سکتا تھا-عمر بھر تو اپنے ناٹکوں اور دوسری ذھنی کاوشوں کی مدد سے وہ خدا کو برا بھلا کہتا رھا-لیکن آخر کار جب اسے خدا ملا تو وہ ایک سہمے ھوئے بچہ کی طرح اس سے چمٹ گیا—

———:o:———

میں پہلے کسی موقع پر کہہ چکی ھوں کہ ھمارے تمام قومی شاعر اصل میں رومانی تھے-اب یہ سوال ھو سکتا ھے کہ "اسٹرن ڈن برگ تو پکا معقولی تھا اس کے متعلق یہ کہنا کس طرح صحیح ھے؟" میرا جواب یہ ھے کہ "اس کے باوجود بھی وہ رومانی ھی تھا"-کیا کوئی بتا سکتا ھے کہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں جس "واقعیت" (Realism) کا چرچا تھا وہ سواے اس کے کہ رومانیت کی ایک مسخ شدہ ھیئت ھو اور کیا کہی جاسکتی ھے؟ ان نام نہاد واقعیت پرستوں نے وھی غلطی کی جو رومانی کر چکے تھے-فرق صرف اسقدر تھا کہ ان کی غلطی معکوس تھی-اگر رومانی اپنی تصویر میں فطرت کو "انسان اعلی" کا ایک شاندار اور روحانی میدان عمل بناتے تھے-تو اسٹرن ڈن برگ اور اس کے تابعین اسے ایک شرانگیز اور قابل نفرت جگہ خیال کرتے تھے جو نہ تو انسان کے رھنے کے قابل ھے اور نہ انسان اعلی کے-بلکہ "انسانی درندوں" کے لئے بنی ھے-یہ لوگ خیالی قصر تعمیر کرنے کی بجاے جیل خانے بناتے تھے-جذبہ کی بجاے ان لوگوں نے منطق و استدلال کو قوت محرکہ مانا-لیکن چونکہ محض منطق و استدلال ھی ھماری قسمتوں پر حاکم نہیں ھیں اس لئے جس نتیجہ پر یہ لوگ پہونچے وہ اتنا ھی "غیر واقعی" تھا جتنا کہ رومانیوں کا نتیجہ-اصل میں ان کی "طبیعیت" سواے "خشک رومانیت" کے اور کچھہ نہ تھی-جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے قائم کردہ تصورات یکے بعد دیگرے اپنی جگہ چھوڑتے چلے جارھے ھیں-تو بقول فلابرٹ کے-ان لوگوں نے یہ نیت کرلی

"کہ انسانیت کے خواب دیکھنے کی بجاے وہ انسانوں کا اسی نظر سے مطالعہ کریں گے جیسا کہ هاتھیوں اور مگرمچھ کا"—

———:O:———

استرن تن برگ نے ان مسائل کا بہت کچھہ جامعیت کے ساتھہ بیان کیا ھے جو انیسویں صدی کے آخر میں لوگوں کے ضمیروں میں کھٹک رهے تھے-لیکن سی-جے آلم کوست غالباً همارا جدید ترین مصنف ھے-جدید سے میرا یہ مطلب نہیں کہ "جو کچھہ آج ھے" بلکہ "جو همیشہ رهے گا" پاؤں میں پر لگا کر وہ همیشہ اپنے هم عصروں کے آگے آگے اڑا کیا-سینٹ سای من سے کہیں پہلے اس نے "اشتراکیت" اور عورتوں کے مساوی حقوق کے متعلق پیشین گوئی کی-ایک ایسے زمانے میں جب شادیاں خود غرضی پر مبنی تھیں-وہ ایسی مناکحت کے خواب دیکھتا رہا جس کی اخلاقی بنیاد سچی محبت پر رکھی گئی هو! اپنے ایک جدید ترین افسانے میں اس نے اس نظریے سے عملی نتائج بھی مستنبط کئے هیں اور ضمیر کا واسطہ دلا کر لوگوں سے قانون طلاق کی آسانیوں-قانونی اور آزادانہ شادیوں کی درخواست کی ھے-مہاتما گاندھی اور دوسرے مصلحوں کی طرح وہ حقیقت میں عملی سیاسیات کا مرد میدان نہ تھا-واقعات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس حد فاصل کو جو عملی زندگی اور تجریدی خیالات کے درمیان هوتی ھے پار کر جائے-حقیقت میں وہ ایک فلسفی تھا اور اپنی خیالی فردوس میں بیٹھکر خواب دیکھتے رهنا اسے پسند تھا لیکن آخر میں وہ مجبور هو گیا کہ کھلے میدانوں میں آئے اور چوراهوں پر کھڑے هو کر اپنے مذهب کی تلقین کرے-جن عوام الناس کے روبرو اس نے اپنے اعلیٰ اخلاق کی تلقین کی وہ سطحی اخلاق اور "گندم نمائی جو فروشی" کے درس یافتہ تھے-جس دنیا میں اسے رهنا پڑا وہ ایسی تھی جو کسی بات میں اس کی همخیال نہ تھی-اس سے وہ کسی قدر خائف تھا اور کسی قدر متحیر بھی-لیکن اس نے همیشہ اس کا شاندار مقابلہ کیا-قسمت نے اسے ایسے هم عصر دئے جو همیشہ اس کی طرف سے افسوسناک غلط فہمیوں میں مبتلا رهے اور همیشہ شد و مد سے اس کی برائیاں کرتے رهے-سویڈی پریس میں بے بنیاد غصہ و غضب کا جو طوفان آلم کوست کے زمانے میں بپا تھا ویسا نہ کبھی اس سے پہلے تھا اور نہ اس کے بعد هوا-مذهبی اور غیر مذهبی سب هی جماعتوں نے اسے مطعون کیا "مخالف عیسائیت"-"بداخلاق"-"نوجوانوں کا گمراہ کرنے والا" یہ سب خطابات اسے دئے گئے-اگر کہیں وہ قرون وسطیٰ میں پیدا هوا هوتا تو شاید توهین مذهب کے الزام میں اسے زندہ هی جلا دیا جاتا-اس وقت بھی اس پر جعل کا الزام لگایا گیا اور اسے ملک سے باهر کر دیا گیا-

اگر واقعات رخ نہ بدلتے تو غالباً " Wildrose " کے مصنف کا یہیں ھمیشہ کے لئے خاتمہ ھو جاتا !

———:o:———

جب میں اس کی جانب توجہ۔سانولے رنگ کے متفکر چہرے پر غور کرتی ھوں جو اس کی فطرت کی طرح گوناگوں اور متضاد خط و خال رکھتا ھے تو مجھے اس کی قسمت پر تعجب ھوتا ھے کہ یہ ایسے زمانہ میں کیوں پیدا کیا گیا جو اس سے اسقدر مختلف اور اس کے پیغام کو سمجھنے کے ناقابل تھا! وہ ھر اعتبار سے زندگی کا ایک گورکھہ دھندا تھا جو اپنے اصلی زمانے سے ایک صدی قبل دنیا میں بھیجا گیا اور تنہا کوشش کرنا۔عجیب و غریب الہامی خواب دیکھنا۔ھزاروں کا مطعون بننا اور بدقت دو چار کی ھمدردی حاصل کرنا۔یہ باتیں اس کی قسمت میں لکھدی گئیں! *

یہ ھماری ھی صدی کے لوگوں کا حصہ تھا کہ وہ اس کی گرد و غبار سے اٹی ھوئی کتابوں کو فرسودہ الماریوں سے نکالیں اور انھیں حیرت و تعجب کے ساتھہ پڑھیں۔ تعجب اس بات پر کہ آلم کوسٹ کو فن حیات اور عورتوں کے متعلق یہ انوکھے اور باغیانہ خیالات کہاں سے ملے؟ بہت ممکن ھے کہ ان میں سے اکثر خیالات کی جڑیں اس نے اپنے وقت کی جرمن اور فرانسیسی ادبیات سے کھود نکالی ھوں لیکن جس طرز پر کہ اس نے ان خیالات کو نباھا ھے وہ اس کی اپنی ھے۔مثلاً سماجی برائیوں سے بحث کرتے وقت اس نے وکٹرھیوگو کی طرح کلفت کو اپنا نقطۂ نگاہ نہیں قرار دیا بلکہ اخلاقی ضرورت پر اس بحث کا مدار رکھا ھے—

آلم کوسٹ کی سب سے عجیب و غریب خصوصیت یہہ ھے کہ اگر ایک طرف اس کے استیپشاری۔نیم عامی معتقدات اسے مذھبی اور سماجی اصلاحات کی طرف لے جاتے ھیں اور انسان اعلیٰ اور جمہوریت کے نظریوں پر ختم ھوجاتے ھیں۔تو دوسری جانب وہ اصلی معنوں میں انفرادیت پسند نظر آتا ھے۔جس چیز نے پہلے پہل اس کے مداحوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا وہ اس کی یہی وسعت نظر اور اوپر۔اندر۔باھر سب طرف دیکھنے کی عادت تھی۔اسی چیز نے ان لوگوں کو ترغیب دلائی کہ وہ اس مصنف کو اپنی ھی روحانی سطح پر جگہ دیں اور اس کی مطلق العنان ذھانت کو وقت کی دستبرد سے بچائیں۔ان ھی لوگوں نے اس کو نفرت۔

---

* شاید غالب نے اسی کی زبان سے کہا ھے—

با من میآویز اے پدر فرزند آذر را نگر * ھرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

مترجم

اور نیش زنی کے تیرہ و تار غار سے کھینچکر باھر نکالا۔جھوٹے بہتانوں سے اس کے نام کو پاک صاف کیا۔لگے ھاتھوں جعل کے الزام کو غلط ثابت کردکھایا۔اور پھر اس کے سر پر ایک نیا اور چمکتا ھوا تاج رکھا۔چنانچہ آج کل " بے دین آلم کوست " اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتا ھے۔اس کا ایک خاص " مذھب " بھی ھے اور اس کی تصنیفات ھمارے لئے معلومات و مسرت کا ایک بے پایاں ذخیرہ ثابت ھوتی ھیں۔ ھماری نظروں میں اسکی حیثیت۔ایک پیغمبر۔رشی اور نجات دھندہ کی سی ھے۔پیغمبر اس اعتبار سے کہ وہ تن تنہا کھڑا ھوا اپنے زمانے کو گھرے سوالات سے جھنجوڑتا رھا اور مستقبل کا امید افزا نظارہ پیش کرتا رھا! رشی ان معنوں میں کہ اسے ذھن انسانی کی عجیب و غریب واقفیت حاصل تھی اور نجات دھندہ اس طرح کہ اس کا ظہور پرانے قوانین کو غارت کرنے کے لئے نہیں ھوا بلکہ غیر ضروری زوائد اور موانع کو دور کرنے اور اسے صاف کر کے نئے اور اعلیٰ مفہوم سے سرفراز کرنے کے لئے وہ اس دنیا میں بھیجا گیا—

اس نے یہہ کوشش کی ھے کہ اس دوی کے پردہ کو جو معمولی اور غیر معمولی۔ کافر اور عیسائی۔جنت و دوزخ وغیرہ کے درمیان حائل ھے اٹھادے اور پہلے سے زیادہ برداشت اور ایک نئی اور روحانی وحدت حاصل کرے۔اسی کوشش کے اعتبار سے اسے " جدید " کہاجاتا ھے—

وہ آزاد خیال ھونے کے ساتھہ ساتھہ پکا مذھبی بھی تھا اور سماجی اور سیاسی انقلاب پسند بھی۔بقول ایلن کی کے " وہ کثرت میں رھکر وحدت کے خواب دیکھتا تھا " —

اس کو اس اعتبار سے بھی ' جدید ' کہہ سکتے ھیں کہ ھمارے مزارعین کو ادبیات میں جگہ اسی نے دی۔اب تک ان کا کام شعراء کی حاشیہ نشینی تھا۔ان کا کام " مصرعہ اٹھانا " تھا۔آلم کوست نے طبقۂ مزارعین سے نہیں بلکہ خاص خاص کسانوں سے بحث کی ھے۔اس نے ان کی فلاکت وافلاس۔ان کی آزادی و خود مختاری۔ ان کے اتقاء اور ان کی ذھانت کی تصویر کھینچی ھے اور ان کے مردانہ استقلال اور ھمت کے نقشے بتائے ھیں۔ھماری سیاسی تاریخ میں کسانوں نے ھمیشہ نمایاں حصہ لیا ھے اور یہہ انہیں کی وطن پرستی اور عشق آزادی کا طفیل ھے جو ھم آج اور ھمیشہ " آزاد قوم " کہے گئے ھیں۔جن لوگوں کو Scandinavia کا اچھی طرح تجربہ ھے وہ اس بات کی شہادت دینگے کہ ھمارے کسان تمام یورپ میں سب سے زیادہ جفاکش اور روشن خیال ھیں۔ھمارے کالبد قومی میں ان کی حیثیت ھمیشہ مہرہ ھاے پشت کی سی رھی ھے اور یہہ شرف آلم کوست ھی کو حاصل ھوا ھے کہ اس نے سب سے پہلے ان کی زندگی کی سچی تصویریں ھمارے سامنے پیش کیں۔

ایسی تصویریں جنہیں بجا طور پر کرشمہ زار مناظر کہا جاسکتا ھے —

——:o:——

اس اعتبار سے بھی اسے جدید کہا جاسکتا ھے کہ وہ کسی قدر ھماری فطرت کے غیر شعوری جذبات کی علمی واقفیت رکھتا ھے - وہ جانتا تھا کہ ذھانت و جنون اور جرم و الہام کے ڈانڈے ملے ھوئے ھیں - وہ پہلا سویڈی تھا جس نے اس حقیقت کو سمجھا کہ جرم اکثر صورتوں میں موروثی جبلتوں کا نتیجہ ھوا کرتا ھے اور اس نے جیل خانوں اور قوانین جرائم کی اصلاح پر زور دیا - جو چیز اسے اس قسم کے مرضیاتی (Pathological) تجربات کی طرف لے گئی وہ یہہ امید تھی کہ ھر روح میں کوئی نہ کوئی جزو خیر دریافت کیا جاسکتا ھے - اسے یقین تھا کہ اگر موجودہ نظام تعلیم کو زیادہ عقلی بنادیا جائے تو مجرمانہ رجحانات رفتہ رفتہ محو ھوجائیں گے اور قوانین جرائم کی ضرورت باقی نہ رھیگی - اس کا عقیدہ تھا کہ فطرت اپنی گہرائیوں میں خود اپنے نقائص کا علاج بھی چھپائے ھوئے ھے - اس حدتک وہ روسو کا ھم خیال ھے - لیکن اس کے آگے وہ نہیں بڑھا - روسو کے متعلق اس کا قول ھے کہ " وہ اپنے دل سے استدلال کرتا ھے اور دماغ سے روتا ھے " —

اپنے جمالیاتی (Aesthetic) عقائد کے اعتبار سے بھی اسے " جدید " کہا جاسکتا ھے - ان عقائد میں رومانی مذھب کے دعوون اور اس کی " علمی شجاعت " کا کثیر حصہ نظر آتا ھے - اس کا خیال ھے کہ سچے معنوں میں ماھر فن بننے کے لئے ضروری ھے کہ ھم دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور Don Quixote (خدائی فوجدار) کے ملازم کی طرح یہ جواب دیں " بیگم صاحبہ! میں ایسی ھی تصویر کھینچتا ھوں - اس لئے کہ ایسی ھی تصویر مجھے پسند ھے " —

——:o:——

جب ھم اس کے فلسفہ اور اس کے نتائج کا مطالعہ کرتے ھیں - اس کے ان جدید اور مائل بہ اکثریت خیالات کا جائزہ لیتے ھیں جن میں ایام گزشتہ کی آرازیں اب تک باقی ھیں اور اس کی ان نظموں کو پڑھتے ھیں جو ایک نادرۂ روزگار شخصیت کی بوباس میں بسی ھوئی اور اپنے حسن کے اعتبار سے سماوی معلوم ھوتی ھیں - تو بے ساختہ ھمارے ھونٹوں تک یہ سوال آتا ھے کہ " دنیا اس کے متعلق اتنی شدید غلط فہمی میں کیوں گرفتار ھوگئی ؟ " اصطلاحی بحثوں سے ذرا دیر کے لئے قطع نظر کرلو - پھر بھی یہ سوال باقی رھتا ھے کہ کیا دنیا کو اس کے مردانہ نظریوں میں اس کی اصلی ذھانت کی جھلک نظر نہ آسکی ؟ کیا اس کا بلند پایہ

یقین اور اپنی طرح دوسروں کی بھی مدد کرنے کا رفیع ارادہ لوگوں کو نظر نہ آسکا؟ اس کی نا تمام آرزؤں اور نا کام مسرتوں میں جو سوز و گداز پنہاں تھا دنیا نے اس کی کیوں قدر نہ کی؟ اگرچہ اس کی زندگی پیچیدگی اور تضاد کا ایک گورکھہ دھندا ھے- پھر بھی اس کے مزاج پر غور کرو تو اس میں تم کو عجیب و غریب اور مسلسل وحدت اور یکسانیت نظر آئے گی-اس کی زندگی کو متفرق ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لئے یہی آخری خصوصیت کافی تھی اس کی ھمیشہ یہ کوشش رھی کہ ظاہری اشکال کے پردہ میں سے جوھر کو حاصل کر لیا جائے اور یہی اس کی "جدت" ھے- جس چیز کی وہ "تخریب" کرتا تھا اسی کی وہ دوبارہ اخلاقی بنیاد پر "تعمیر" کر دکھانے کا دعویٰ کرتا تھا-لیکن چونکہ بد قسمتی سے جس "دوی" کے خلاف کہ وہ جد وجہد کرتا رھتا تھا-خود اسی کا شکار تھا-اس لئے اکثر صورتوں میں اسے کامیابی نصیب نہ ھوئی-اس کے ذھنی اور جسمانی قواء کی جس زمانے میں تکمیل ھوئی وہ آزادی اور حریت کا زمانہ تھا لیکن ایسی آزادی اور حریت جو ماضی کے موانعات پر غالب آنے کی تو کوشش کرتی ھے مگر سیاسی اور سماجی موانعات سے گھبراتی ھے! "شرافت خاندانی" کے بدلے خوشحال اور نمائش پسند سماج میں "سیم و زر" کی پرسش ھوتی تھی اور آلم کوست اور اس کے اصلاحی تصورات کے ساتھہ جو ظالمانہ برتاو روا رکھا گیا اس کا زیادہ تر یہی سبب ھوا—

—:o:—

آلم کوست کی دو حیثیتیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھیں-ایک تو وہ آلم کوست تھا جو معاشری مصلح تھا-لیکن دوسرا آلم کوست وہ تھا جو اپنی خیالی بہشت میں آرام کے ساتھہ بیٹھا ھوا دنیا کو فراموش کر چکا تھا اور توصیف اور تفضیح دونوں سے قطعاً بے نیاز ھو کر "خالص محبت" کی پاک اور بے لوث زندگی بسر کرتا تھا-ایسی زندگی جو "حال" پر قانع رھتی ھے اور فضول ادھیڑ بن میں نہیں پڑتی-یہ اس کی فلسفیانہ حدود تھیں جو مصنوعی نہ تھیں بلکہ خود ساختہ اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں سے نکلی تھیں-یہ ھی محبت کا فلسفہ اس کی کتاب "Book of the Wildrose"- "جنگلی گلاب کی داستان" کی روح رواں ھے- اس کتاب کا منشاء یہ تھا "کہ کائنات کا عکس لیا جائے"-اس کتاب کی علامت ایک جنگلی گلاب کی تصویر تھی اور اس کے نیچے یہ عبارت درج تھی "خوشرو ھمجنسوں کی سبھا"-آلم کوست اپنے تصوفانہ انداز میں دنیا کو ایک گلاب کا پھول اور مشقت-حسن-یقین اور دوسری دنیاوی جد و جہد کو پنکھڑیاں سمجھتا تھا- مذکورۂ بالا عبارت میں اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ھے-یہ کتاب ھماری سویڈی

"هزار داستان" هے اور اس میں ادبیات کی جملہ اصناف مثلاً افسانہ-نظمیں-ڈرامے-مضامین-رزمیہ-دھقانی شاعری کے نمونے-حتیٰ کہ راگوں کے نمونے بھی شامل ھیں—

———:o:———

وہ کہتا ھے:—

"میں انسانی جماعتوں سے دور دور بھاگتا رھا میں نے اپنے تخیل میں اپنی دنیا علیحدہ پیدا کی-اس دنیا میں مجھے زیادہ لطف اس وجہ سے آتا تھا کہ میں اس کے رھنے والوں سے بلا خوف اور بغیر کوشش روابط پیدا کر سکتا تھا-یہ ھمیشہ میرے اشاروں پر چلتی تھی اور جیسا کچھہ میں بتانا چاھتا تھا بن جاتی تھی"—

———:o:———

اسٹرن ڈن برگ کی طرح اس نے بھی "بچپن ھی سے خدا کی تلاش کی" لیکن جہاں اسٹرن ڈن برگ کو صرف شیطان ملا-آلم کوست "عشق" سے دو چار ھوا اور یہی عشق اس کے فلسفہ کا تصوفانہ جوھر ھے—

"عشق ایک راز ھے اور اس کی ابتدا اور
اس کے اثرات دونوں پر اسرار ھیں
عشق کی جسارت کرنا اور مرنے سے واقف
ھونا دونوں ایک ھی بات ھیں
سب سے بڑی آزمائش جو کسی شخص کی
ھو سکتی ھے یہ ھے کہ اس سے عشق پیدا کرو
عشق ھماری ھستی کا جوھر اصلی ھے اور بغیر کسی
تامل کے ھمیں اس جبلت کی پیروی کرنا چاھئے"

———:o:———

اسٹرن ڈن برگ کے فلسفہ کا آلم کوست پر گہرا اثر پڑا اور اس نے اکثر اسے نظم بھی کیا ھے مثلاً Murnis (مرنس) یا "قصص رفتگان"-" Tales of the dead " دونوں عشق کو یقین کی جان سمجھتے تھے لیکن آلم کوست اس سے بھی آگے بڑہ گیا ھے وہ کہتا ھے "عشق روح کی جان ھے اور عشق ھی خدا ھے" کائنات کا ساز ھم آھنگ ھے-

جتنی بھی چیزیں اسے نظر آتی ھیں ان سب میں ''ابدیت'' کی جھلک ھے اور یہ فی الحقیقت عشق کی جھلک ھے اس کا مقصد یہ ھے کہ ارض و سما کو ملا دیا جائے قلب انسانی میں حسن و مذھب کو ضم کر دیا جائے اور خود مذھب میں کسی قدر عجائبات پرستی کی شان پیدا کر دی جائے-اس کا خیال ھے کہ عیسائیت کو سرور و انبساط کا مذھب ھونا چاھئے-''انبساط و سرور غم و اندوہ سے قدیم تر ھیں-اس لئے کہ بہشت کا وجود ھبوط آدم سے پہلے بھی تھا'' اس نے ایک مذھبی ناٹک ''مریم'' لکھا ھے-اس میں وہ کہتا ھے:—

''بچے ایک دوسرے سے عشق رکھتے ھیں! بہت کم لوگ ایسے ھیں جو عشق سے نا آشنا رھکر اس راز کو سمجھ سکیں-وہ ھمیشہ علامتوں-خیالوں اور جھلوں میں مدد و استعانت کے جویا رھتے ھیں اور باوجودیکہ وہ بغیر مدد و استعانت کے رھتے ھیں پھر بھی یہی کہتے ھیں کہ ھماری مدد کی گئی-خداوندا! تیرا دن ڈھل گیا ھے لیکن یہ دوبارہ طلوع ھوگا''—

رومانیوں کی نظر میں حسن و عشق خیالی اور مثالی چیزیں تھیں لیکن آلم کوست چاھتا تھا کہ ان کو ھماری زندگیوں میں داخل کر دے-شاعری کو وہ ایسا پل سمجھتا تھا جو اس دنیا کو اس دوسری دنیاے حسن کے ساتھہ ملا دیگا-'' جو شعرا اتنی گریہ و زاری کرتے ھیں انھیں چاھئے کہ اپنے رومال دھو ڈالیں اور ان سے بنی نوع انسان کے آنسو پونچھیں''—

———:0:———

نوجوانوں سے آلم کوست اس لئے محبت کرتا تھا کہ یہ لوگ ھمیشہ جوھر کی تاک میں رھتے ھیں—

''شباب ھی دنیا کو آگے بڑھاتا ھے-یہ میرا رفیق ھے-اس لئے کہ یہ روح کی حمایت کرتا ھے''—

اور نوجوانوں کو بھی اس سے الفت ھے-اس لئے کہ وہ اپنے خیالات-افعال اور خوابوں میں ''نوجوان'' ھے-انھی کی طرح جلد باز-ویسا ھی شریف-ویسا ھی پیش دست! وہ انھی کی طرح سیانا-وجدان پرست اور آزادی کا دیوانہ ھے-سب سے بڑی بات یہ کہ وہ سرتاپا سویڈی ھے اور اپنی قوم کی طرح الہامی لمحات میں روح کی معمولی افادی سطح سے بلند ھوکر تصوف کی معراج حاصل کر لیتا ھے—

———:0:———

شعرا کی ان جگمگاتی ھوئی صفوں سے گزر کر جب ھم خاتمہ پر پہونچتے ھیں

تو ہم کو عجیب بے ترتیبی نظر آتی ہے۔اس مقام پر پہونچ کر ادبی مذاہب کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔واقعیت اور رومانیت کے پے در پے منازل طے کرکے اب ہم اپنے آپ کو اس جگہ پاتے ہیں جہاں یہ نام ایسے ہی دوسرے ناموں سے مخلوط ہوکر رہ گئے ہیں۔قدیم بسیط اور سادہ جبلتوں کی جگہ ہمیں ایسی ذہانت سے دو چار ہونا پڑتا ہے جس کی پیچیدگیاں روز افزوں ہیں۔قدیم فطری روانی کی جگہ ہم کو آورد اور معرکات نظر آتے ہیں۔شاعری کے منابع اور عناصر میں آج ہمیں وہ اگلا سا اچھوتا پن نظر نہیں آتا۔آج کل "ادب" سے مراد نئے اور نا معلوم میدانوں میں موشگافیاں کرنا نہیں ہے یہ سب کچھ ہے لیکن "عجوبہ پسندی" کا وہی شوق آج بھی باقی ہے۔روح انسانی کے تاریک ترین مقامات تک ہم دارانہ بڑھتے چلے جارہے ہیں لیکن جس درخت کے پھول پھل انیسویں صدی کی ادبیات کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے اور جو درحقیقت ہماری نشاۃ ثانیہ تھی اسی درخت کے تنوں میں آج کل آب زندگی خشک ہوتا چلا جارہا ہے—

"وہ سب چلے گئے۔بالکل چلے گئے۔آج مغرور شخصیتیں
پہلو بہ پہلو آرام کرسکتی ہیں۔اگرچہ ہم کو گانے
کا اذن مل چکا ہے۔لیکن خبردار! کوئی نغمہ بلند
نہ ہو۔ وہ تو جاچکے! اب ان کے عشق و محبت
کے پنہاں دشت وجبل میں صرف
آہستہ بولنا ہی کافی ہوگا!!"

———:O:———

بے شک! وہ عشق و رومانیت کے مطرب اب چلے گئے ہیں۔ان کو عشق سے عشق تھا۔حیات انسانی کے متعلق ان کی بصیرت ملہمانہ تھی۔وہ قوس قزح کے زریں کناروں کو زر کی تلاش میں کھودتے تھے اور خوش رہتے تھے۔جس ترتیب میں وہ آتے اور رخصت ہوتے گئے ہم اسے نام بنام بتا چکے ہیں۔ہاں نام بتا کر اور اپنے کم فہمانہ کتبہ ہائے مزار پڑھ کر ہم انہیں بدنام کرچکے ہیں۔ان کے نغموں کی گونج ابھی تک ہمارے کانوں میں باقی ہے۔ان کے نور کی ہلکی ہلکی جھلک ابھی تک ہمارے گرد وپیش باقی ہے اور ہم مفلس رشتہ داروں کی طرح ترکہ کے لئے دست و گریباں ہورہے ہیں! ان کی سوانح اور ان کے طرز عمل کے متعلق جتنے متنازع فیہ مسائل تھے ختم ہوچکے ہیں۔اس لئے کہ ہم ہر چیز کی تعئین کرچکے ہیں یا کم از کم ایسا خیال کرتے ہیں۔ہم وضاحت کے ساتھ بتلا سکتے ہیں کہ کس کی ذہانت کا چراغ کب گل ہوا اور وہ کب پاگل ہوا۔ہم نے یہ بھی تحقیق سے معلوم

کر لیا ھے کہ آلم کوست دغاباز اور سارق نہ تھا۔یہہ تو ھے۔لیکن ان کی شاعری !! طویل اور پر از نتائج مباحثہ کے لئے ھمارے پاس کیسا اچھا مواد موجود ھے ! میرا یہہ منشاء نہیں ھے کہ ھم صرف بعض جرمنوں کی طرح "سوسن کی تصویر کھینچیں اور ایک قدیم فن کو فروغ دیں"۔لیکن یہہ حقیقت ھے کہ ھم آنکھیں بند کر کے کسی حصۂ نظم و نثر سے لطف اندوز ھونا نہیں جانتے۔ھم کو تو اصلی لطف جب ھی آتا ھے جب ھم انگلی ڈال کر کسی نازک خیال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ھیں۔یا جب کسی نظریے کی تغلیط میں کامیاب ھو جاتے ھیں ! ھم کو تو یہہ ثابت کرنے میں لطف آتا ھے کہ ایکسل لونڈے گارڈ * دراصل وکٹوریہ بینی ڈیٹسن تھا اور یہہ کہ موخرالذ کرنے اول الذکر کے عشق میں جان دی اور اپنی موت سے نہیں مری۔اس کا کیا سبب ھے ؟ کیا ھم میں اس نظر کی کمی ھے جس کی مدد سے ھم اپنی چیزوں کو انصاف کے ساتھہ جانچیں یا پھر کیا ھم اتنے جدید ھوگئے ھیں کہ فن موسیقی کو کھو بیٹھے ھیں۔وہ فن جو اسی وجہ سے ھے کہ "پرفنی" سے خالی اور سادہ ھے ؟ کیا ھم اتنے منزہ اتنے چھان بین کرنے والے اور اس قدر پر متانت ھیں کہ پرندوں کی طرح سادگی سے گانا عجیب سمجھتے ھیں ؟ یا پھر کیا ھم کسی ایسی "نساۃ" کے قریب ھیں جو پہلی کے مقابلہ میں زیادہ شاندار ھوگی۔جیسی کہ آئر لینڈ کو یٹس (Yeats) میں نصیب ھوئی ! کیا شلر (Schiller) کا خواب کبھی ھمارے لئے اصلیت بن کر ظاھر ھوگا اور ھم ایسی بہشت میں داخل ھوجائینگے جہاں فاتح کی حیثیت سے ھم کو ھم آھنگی اور سکون بطور انعام کے حاصل ھوں گے۔ایسی بہشت جہاں جبلت اور قانون کی جنگ ختم ھو جائے گی حسن کی حکومت ھوگی۔دنیاوی قیدوبند سے آزاد ھوکر صداقت مطلق العنان ھوگی ! جہاں سچے "واقعیت پسند" سچے مثالیت پسندوں (Idealists) سے مل جائیں گے اور دلوں کو کسی نئی جنگ کا سامنا کرنا نہ ھوگا۔ایسی بہشت جہاں کا بلند ترین نغمہ "سکون" ھوگا۔وہ سکون نہیں جو جبریہ صبر اور جمود کا مرادف ھے۔بلکہ وہ سکون جو کمال سے پیدا ھوتا ھے اور قوت اور طاقت کا سرچشمہ بن جاتا ھے !

—:0:—

* یہ تلمیحات سویڈی ادب سے متعلق ھیں۔اس کا منشا یہ ھے کہ تجسس علمی کے شوق میں ھم اس ادب کے حسن سے بے خبر رہ جاتے ھیں۔اردو ادبیات میں اس کی بہترین مثال وہ مختلف طویل مقدمے ھیں جو غالب نظیر وغیرہ کے کلام پر لکھے گئے ھیں اور جن میں علمیت کا ذوق خالص جمال پسندی کے رجحان پر غالب آگیا ھے — مترجم

وہ هوں پهول جس کا پهل نهیں هے

از

(جناب محمد عظمت اللہ خان صاحب بی-اے)

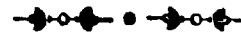
کوئی شے بهلی بری نهیں هے کوئی بات یاں اٹل نهیں هے
هے یه زندگی عجب پهیلی کوئی اس کا یاں تو حل نهیں هے
وہ هوں پهول جس کا پهل نهیں هے وہ هوں آج جس کی کل نهیں هے

کسی گود ماںتا بهری کی میں بهی چین اور سکهه کبهی تهی
کسی آنکهه کی تهی میں بهی پتلی میں بهی نازوں میں کبهی پلی تهی
وہ هوں پهول جس کا پهل نهیں هے وہ هوں آج جس کی کل نهیں هے

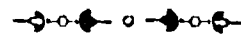
ابهی کچهه هوئی نه تهی سیانی که اٹها بڑوں کا سر سے سایا
تو زمانه نے یه پلٹا کهایا که کسی کو پهر نه اپنا پایا
وہ هوں پهول جس کا پهل نهیں هے وہ هوں آج جس کی کل نهیں هے

نه خبر زرا بهی لی کسی نے پڑے اپنے جان کے هی لالے
مرے سامنے کهڑے تهے فاقے پڑی کیا غرض کسی کو پالے
وہ هوں پهول جس کا پهل نهیں هے وہ هوں آج جس کی کل نهیں هے

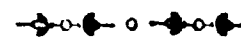
یہ کتر دلوں کی طوطہ چشمی مرے من میں تیر سی ھی بیٹھی
گئی من کے پھول کی تراوت اڑی اوس کی طرح سے نیکی
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



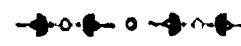
نہ رہا کسی پہ کچھہ بھروسہ نہ رہا کوئی مرا سہارا
نہ رہی کسی کی میں ھی پیاری نہ رہا کوئی مرا ھی پیارا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



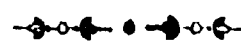
تھیں وھیں پڑوس میں طوائف تھا بڑا ھی نامی ان کا ڈیرا
مرے سر پہ ھاتھہ انہوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



کھلی سامنے نئی ھی دنیا نظر آئے سب نئے وتیرے
نئی گفتگو نئے طریقے نئی جستجو نئے وسیلے
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



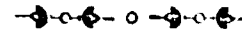
مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا
مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن کو ڈھالا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



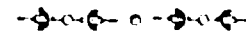
کھلی آدمی کی ساری قلعی مجھے زندگی کا گر سکھایا
مجھے اصلیت سے جا بھڑایا مجھے گویا خواب سے جگایا
وہ ھوں پھول جس کا پھل نہیں ھے وہ ھوں آج جس کی کل نہیں ھے



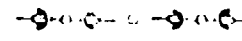
غرض اس طرح کی پا کے سکھشا نظر آئی زیست ایک میلا
ہیں جہاں جوئے کی سب دکانیں وہی ہار جیت کا جھمیلا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



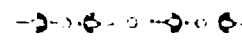
تھی حسینوں میں مری نہ گنتی نہ تو حور تھی نہ میں پری تھی
مرا رنگ سانولا سلونا مری نین بجلیاں بھری تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



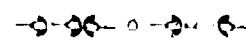
مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو جیسے ابر کالا
مرا سینہ بھی امڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھرتھراتا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



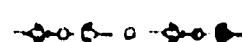
مری بات چیت ایسی دلکش کہ ہر ایک بول دل میں اترے
مری سحر تھی لطیفہ سنجی مرے فقرے چست صاف ستھرے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



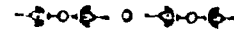
رہی دل لگی مری بہت سے نہ مگر کسی سے دل لگایا
رکھی ہر طرح سے تندرستی یوں جہان کا مزا اڑایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



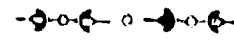
مرے عاشقوں کی تھی نہ گنتی مرا فن میں تھا بلند پایا
مرے گرد ھن برس رہا تھا میں دھنی ہوئی وہ دھن کمایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



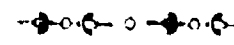
جو هیں نیک آپ کو سمجھتے مجھے بیسوا پکارتے هیں
وہ مگر هیں اصلیت سے کورے نری باتیں هی بگھارتے هیں
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



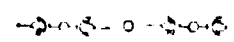
میں بنی تھی عشق عاشقی کو کہ هے استری کی یہ بھی فطرت
کوئی یاں اٹھائے بال بچے تو کوئی اڑائے عیش و عشرت
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



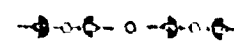
هو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے هے پیٹ بھرنا
کہیں عیش اور عشق‌بازی کہیں ایک هی خصم کا بھرنا
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



مجھے ایک تیتری سمجھئے مرا کام پھول پھول اڑنا
کہیں رس کے واسطے ٹھٹکنا کہیں پنکھڑی پہ جھول اڑنا
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



مری زندگی بڑا سبق هے کہ یہاں کی خوب سیر کی هے
هے مزے کی چیز پر یہ دنیا نہ تو شر کی هے نہ خیر کی هے
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



جسے دیکھو اپنے داؤ میں هے چلا داؤ اور وہ پچھاڑا
کہ یہ زندگی هے ایک کشتی یہ جہان اک بڑا اکھاڑا
وہ هوں پھول جس کا پھل نہیں هے وہ هوں آج جس کی کل نہیں هے



نہیں اس جگہ کوئی کسی کا کہ ہے آدمی غرض کا بندا
یہ سدا سے ہی یہاں کا دھندا یونہیں بس رہا رہیگا گندا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے



جاپان کی بعض ھمعصر شاعرات

مترجمۂ مولوی سید ہاشمی صاحب



[ذیل کا فاضلانہ مضمون پروفیسر ای ای اسپیٹ کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور دو سال ہوے جاپان کے ایک انگریزی اخبار میں چھپا تھا۔ پروفیسر اسپیٹ انگریزی زبان کے بہت اچھے ادیب اور ایک ممتاز شاعر ہیں اور سالہاے دراز تک جاپان میں رہنے کے بعد حال میں حیدرآباد آے ہیں اور درحقیقت یہ نظام کالج اور جامعہ عثمانیہ کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں انگریزی کی تعلیم کے لئے ایسا فاضل استاد ملا۔ ہم صاحب موصوف کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس مضمون کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی خوشی سے اجازت دی اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی پروفیسر اسپیٹ اور ان کی انگریزی شاعری کے متعلق رسالۂ اردو میں کوئی مفصل مضمون لکھنے کا موقع نکالیں گے۔ اڈیٹر]



" سیجاکو وا
ایہازو توتوکی
امت سوچی ني
کوے ناکو سوکي نو
وارتو اری تاوا "

(اسوقت کا سناٹا کتنا قیمتی ہے۔ زمین و آسمان صدا سے خالی ہیں اور میں چاند کے ساتھہ تنہا ہوں !)

(از بیگم کو جو)

کارل بسے کا قول ہے کہ ہر قوم کا علم ادب اسی قدر ہے جتنی کہ وہ اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن ایسا پردیسی جسے جاپانی علم ادب کے ساتھہ اتنی واقفیت ہو کہ وہ

اس معیار کے مطابق جاپانی قوم کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرسکے ہنوز منصۂ شہود پر نہیں آیا ہے۔اور حق یہہ ہے کہ اس اعجاز نمائی کے لئے سالہا سال کی محنت فطری مناسبت اور وہ شوق صادق درکار ہے کہ آدمی حصول مراد کی امید میں اسی کام کا ہو رہے۔ہمارے اور جاپانیوں کے افکار میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ ہمارے اور ان کے افکار کے درمیان غیر تحریر۔غیر زبان اور غیر استعارہ کے تاریک حجاب حائل ہیں اور ان کی ایک قدیم نظم کا صحیح مفہوم لفظی ترجمہ کے ذریعہ سے سمجھانا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے جتنا کہ لوگ بے پروائی سے خیال کر لیتے ہیں۔جاپانی شعر کا مفہوم سمجھنا دریا کی ایسی گہرائیوں میں اترنا ہے جن کا سطح پر سے بہت کم لوگ اندازہ کر سکتے ہیں۔وہ زمان و مکان دونوں سے جن میں ہم الجھے ہوے ہیں ماوری ہے۔چنانچہ جاپانیوں نے اپنے اشعار کو اس قسم کے ناموں سے موسوم کیا ہے جیسے "حال جاودانی" اور مثال کے طور پر جن قلبی کیفیات کا مندرجہ عنوان ابیات سے اظہار کیا گیا ہے۔وہ اگر ہے تو کچھہ اس موسیقی سےمشابہ ہے جس کا نغمۂ ناشنیدہ ہند کے قدیم جوگیوں کو یاد دلا دیتا تھا کہ اس گیان دھیان کا وقت آگیا جو صرف سکوت وعبادت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جس کی یادگار کبھی اگر رہی تو صرف کامل گیت کی صورت میں محفوظ رہی:—

"اوراکانی
اوئیرا مکیت
کھوری ہیکو
واگا هارو نو هی نو
جی نو کورو کانا"

(میری بہار کے دن جب بخوردان سے عود کا دھواں چکر کھاتا ہوا اوپر چڑھتا ہے۔اسوقت میرا حجرہ ایک بڑے مندر کے مثل اور میرا دل ساکن و مطمئن ہے)

(مسز اکیکو یوسانو)

———:o:———

مجھہ سے ایک مرتبہ رابندرا ناتھہ ٹیگور نے نرم اور دردمندانہ الفاظ میں بیان کیا کہ جاپانی شاعری کے اس طرح چشم عالم سے مستور ہوجانے کا انہیں کس قدر قلق ہے۔ان کے نزدیک اس شاعری میں جس کی تہ کا مطلب اتنی دشواری سے ہاتھہ آتا ہے ضرور کوئی نادرو نایاب شے پنہاں ہوگی۔مغربی شاعری کے متعلق وہ اور میں اس بات پر متفق تھے کہ قریب الفہم ہونے کے باوجود اس شاعری میں بار بار ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو اصل مفہوم کو عقدۂ سربستہ بنا کر چھپا

لیتے ھیں-مگر خود ٹیگور کے پردۂ باطن کا راگ تو اس دم ساحری کا منتظر اور اس نغمے کا مشتاق تھا جس کی تال اس کی اپنی حرکت قلب کے ساتھ ھم آھنگ ھو- شاید اس کی دلی کیفیات اس نابینا کے جذبات سے مشابہ تھیں جنکی مسز ھو ھر کو کتا یاما نے تصویر اتاری ھے:—

کوجو مشی ای
نہی کو نو ھستو دو
ماچی وابی نو
کازے وا نیشی فکی کامتا می نامی فوکو "

(مغرب کی طرف اور جنوب کی طرف ھوائیں تیز چل رھی ھیں-مگر یہ اندھا بہت دیر سے دست رھنما کے انتظار میں ھے!)

مجھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جاپان کی ھم عصر شاعرات کے اشعار میں ھمیں اس صدا کا جواب ملتا ھے جو رابندرا ناتھہ کے علاوہ اور بھی بہت سے اھل فکر بلند کرنے پر مجبور ھوئے ھیں-یہ لکھتے وقت میرا اشارہ بالخصوص اس صنف اشعار کی طرف ھے جسے اوتا یا تانکا کہتے ھیں-ورنہ ھوکو کو میں اتنا باوقعت نہیں سمجھتا اور اس کا سبب یہ نہیں کہ ان چھوٹے ظروف میں بڑے خیالات سما نہیں سکتے-بلکہ دراصل جاپانی زبان میں صرف سترہ رکن کی نظم کو کسی مربوط بحر میں لانا ممکن نہیں ھے-اور شاعری کے تمام عناصر ھیں-میں بحر کے پرکیف وجدانی اثر ھی کو سب سے زیادہ ضروری شے سمجھتا ھوں-خود ھماری زبان میں ھوکو کی کئی مثالیں موجود ھیں جو سب سے الگ تھلگ ھونے کے باوجود کمال شاعری کا نمونہ ھیں-چنانچہ یہ کسی جاپانی استاد کا نہیں بلکہ رچرڈ جیفریز کا شعر ھے:—

"When the crescent of the new moon shone,
All the old thoughts were renewed."

———:o:———

مگر ھمیں اس مختصر مضمون میں ھوکو کی طرح جاپان کی بلاوزن نظموں کو بھی اپنے تبصرے سے خارج رکھنا مناسب ھوگا-جاپانی زبان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تقلید میں اس قسم کی بہت سی نظمیں کہی گئی ھیں-لیکن جاپانی ادب میں شاعری کی یہ صنف ابھی تک وہ درجہ نہیں پاسکی جو انگریزی یا فرانسیسی میں اسے حاصل ھے-اپنی زبان کی ساخت کی وجہ سے جاپانی شعرا کو وھی مجبوریاں پیش آرھی ھیں-جو ایک روز گویٹی اور ھائنے کو پیش آئی تھیں-اگرچہ ان کی لسانی مشکلات کے اسباب دوسرے تھے مگر اتنا غنیمت ھے کہ ان کی زبان

ایسی پرشوکت اور جہیرالصوت بھی نہیں ہے جیسی ہسپانیہ والوں کی جس میں ادنیٰ سی ادنیٰ بات کہنے میں تکلیف وطمطراق پیدا ہو جائے۔اصل یہ ہے کہ بلا وزن نظم میں زیادہ تر عام زبان استعمال کی جاتی ہے اور جاپانی روز مرہ میں کثیر الفاظ ایسے داخل ہیں-کہ اصل چینی ہیں وہ کیسے ہی پر لطف کیوں نہوں-جاپانی میں بے زور ہوکر محض پرانا سکہ رہ گئے ہیں-بایں ہمہ اصلی اوتا ابھی تک حوادات روزگار سے محفوظ ہے اور روش اساتذہ یہی ہے کہ اوتا میں قدیم الفاظ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ زیادہ کیا جائے اور ان الفاظ میں اصوات و کنایات کا وہ نادر حسن پایا جاتا ہے جنکی نظیر اگر ملے گی تو یونانی زبان کے لطیف تریں اشعار میں ملے گی-لیکن جس طرح یونانی نظم کے بعض بہترین قطعات سافو سے لے کر زوناس تک) ایک ہی رکن کی تکرار سے بد صورت ہوگئے ہیں اسی طرح بعض جاپانی ابیات میں صوت و معنی کی باہمی مناسبت مفقود ہے اور ان کے اعلیٰ تخیلات کی جیسی داد غیر زبان کے ترجمے میں دی جاسکتی ہے اصل زبان مین نہیں دی جاسکتی-اس کی مثال مسز اکیکو یوسانو کی یہ نظمیں ہین:—

"شیرانامی نو
نونونی سوگاریتی
ارای سو نو
اکی نو ہاجیم نو
تشوکی نوبوری کی نو"

(ساحل صحرائی پر خزاں کا پہلا چاند طلوع ہوا کہ امواج سفید کی عبا سے لپٹا جاتا تھا)

"نات سوگومو نو
کزد ریت اوچی شی
شیرو نو کیشی
ہی نو کتا ہاشی نو
کوری نائی نو کشی"

(کوکنار کے سفید پھول موسم گرما کے شکستہ واوفتادہ بادلوں اور سرخ پارہ ہائے آفتاب کے مانند معلوم ہوتے ہیں)

مذکورۂ بالا ہردو تانکوں میں بعض حروف علت کی تکرار ہم کو اپنے علم ادب کی اسی قسم کی امثلہ کو یاد دلاتی ہے مثلاً ٹنی سن کہتا ہے—

" Passed up the rich city to his kin "

لیکن جاپانیوں کے نزدیک " نو " اور " شی " کے ارکان کی تکرار ناگوار

نہیں گزرتی اور بہت ممکن ہے کہ اس سے ان کا دماغ کسی گت کری یا دوسری لے کی طرف منتقل ہو جاتا ہو اور اصلی نغمے میں یہ ننھی ننھی گھنٹیاں تنوع کا لطف پیدا کرتی ہوں اور انہیں رواج قدیم نے اسی غرض سے جائز قرار دیا ہو—

———:o:———

ٹانکا جیسی صنف کی کوتاہیاں ظاہر ہیں-اس کے دائرے کو بند کے درجے تک کبھی وسعت نہیں دیگئی-اس لئے ہم اس کو کسی ایسی صنف نظم میں داخل نہیں کر سکتے جو موسیو پال کلاڈیل کے الفاظ میں "خیالات و تمثلات کے زبردست دھارے" کی شان رکھتی ہے-اسی کے ساتھہ ٹانکا شاعری کی محض اس ہرک کا نتیجہ نہیں ہے جسے اسی فرانسیسی مصنف نے پو اور بودیر کے کلام کی تنقید کرتے وقت "اعصاب دماغ کی چھیڑ" سے تمثیل دی ہے—

دراصل دنیا کے بڑے بڑے شعرا نے اسی طرح ٹانکے کی مثل چھوٹے چھوٹے قطعات میں پھول بکھیرے ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سے خشک پتیوں میں چھپے ہوئے ہیں-سیفو کی شاعری کے جس قدر دل آویز ٹکڑے باقی رہ گئے ہیں وہ جاپانی نظموں کی طرح مختصر ہیں اور شاید نظم کا جس قدر حصہ ہمیں یاد ہو وہ ایسے ہی چمکدار و نظرافروز خزانوں پر مشتمل ہو جیسا کہ بہترین ٹانکا ہوتا ہے- انگریزی نظم کے مندرجۂ ذیل اشعار طول کے اعتبار سے قریب قریب ٹانکا کے مساوی ہیں—

" There is in God some say
A deep but dazzling darkness as men here
Say it is late and dusky because they
See not all clear."

(از ہنری واگہن)

" At my back I always hear
Times winged chariot hurrying on
And yonder before us lie
Deserts of vast eternity."

(از اندر یومارویل)

" My brother prays so saith Kabir
To brass and stone in heathen wise
But in my brother's prayers I hear

My own unanswered agonies."

———:o:———

میں جب نظموں کے اس انتخاب پر نظر ڈالتا ہوں جو عصر حاضر کی لا تعداد شاعرات میں سے چند کی تصانیف سے کیا گیا ہے تو یہ مجھے ایک خوبصورت لڑی معلوم ہوتا ہے جس کے موتی گہرے رنگ کے چمکدار اور شوخ ہونے کے ساتھہ متانت بھی رکھتے ہیں اور موسم خزاں کے چاند کی طرح صاف و شفاف یا قدیم جنگل کی طرح پر اسرار ہیں —

تسوبا کی طرح اوتا کے محدود دائرے میں بھی جاپان کی اختراعی قابلیت ان سب چیزوں کو محفوظ رکھتی ہے جن کو یہ عزیز یا محترم جانتی ہے یا جن سے خوف کرتی ہے۔اگرچہ تسوبا بہت متین صنف کلام ہے اور اس میں خاص طور پر خشیت و تقوی کا رنگ ہوتا ہے۔تاہم اوتا میں بچپن اور جوانی کی خوشیاں اور عہد مادری کی تنہا گھڑیاں آرزوئیں اور ارمان نہایت آزادی کے ساتھہ بیان کئے گئے ہیں:—

" نن گیو نی
کوئی و و یوروشی نو
تاراچیبنی وا
اتے کے ناکی ھی نو
چی ساکی کینا نی "

(بچپن کے دنوں میں میرے چھوٹے ہاتھوں میں گڑیاں ہوتی تھیں۔میں ان کو پیار کرتی اور میرے ماں باپ اس دلدادگی کو جائز رکھتے تھے)

" میوسا شینو نو——الخ "

(لڑکپن کے زمانہ میں میوسا شینو کے پیڑوں میں اپنی والدہ کے برابر کھڑے ہوکر میں ڈوبتے سورج سے دعائیں مانگا کرتی تھی)

" آو آو تو
تسوکی سے شی۔اریبا
ھاھا توکو گا
ٹوموشیبی مو سیڈی
نیشی موری نوای "

(چاند کی سبز شعاعیں جب ہمارے بیابانی گھر کے اندر آتیں تو اس وقت میں اور والدہ بغیر چراغ جلائے سو جایا کرتے تھے)

(از مسز مت سوکوشیگا)

"ھا ھا وا واگا
اوچی-سی کے تاچینوں
اوتورو وو
نیگی کی وو یامیرو
کوکو رو وا شیرازومو"

(میری والدہ میری صحت کے خراب ھو جانے سے پریشان ھیں مگر میرے دل میں جو درد ھے اس کی انھیں خبر نہیں)

(مس اساؤھارا)

———:o:———

"کونو ھو کا جی
کانا شی کاری کے ری——الخ"

(جب میں اس کے دل کا خیال کرتی ھوں جس کو میں نے ناکام واپس کردیا تو مجھے یہ روشنی بہت اداس معلوم ھوتی ھے)

(مس تاکاکویزادا)

"نی گوری تارو
اموئی وا موتاجی——الخ"

(میں کسی قسم کے غمگین خیالات کو اپنے دل میں جگھہ ندوں گی مبادا وہ مورت دھندھلی ھو جائے جو میرے دل میں بسی ھے)

(مسز ھروکو کتایاما)

"یو سوارو نو
نیرو نو افوکو و و——الخ"

(جب میں اس کو ھلکے رنگ کی فلالین کا لباس پنھا دیتی ھوں تو یہ——میری کمسن بچی اور بھی نرم و گداز بدن نظر آنے لگتی ھے)

(مسز کشیکو واکا یاما)

———:o:———

کہیں کہیں واردات قلبی کے اشارات آجاتے ھیں جو بالکل نادر یا سوز باطن سے تپاں نظر آتے ھیں:—

"کے می نو کووا
نو سوری نو سوریتو
ھتی یوکو
کیمی دارو کے ری تو

دارے مو یاکو کانا
(جوان کچھووں کے آہستہ آہستہ چلنے سے مجھے ایک طرح کی کوفت ہوتی ہے۔
مگر اس کے وجود میں بالکل انہیں کی طرح چلتی ہوں)
(مسز ہیروکو کتایاما)

" یو کی کاایری
یاچی مان سوجی نو —— الخ "
(بچپن کے زمانے میں جب میں ہچین کے بازاروں میں آئینہ سازوں کی
دوکانوں کے پاس سے گذرتی تو آئینوں میں اپنے گھر کی بندش کا عکس دیکھتی تھی)
(مسز اکیک یوسانو)

" ہونو ناسو
ہی نو فوسوما سی وو —— الخ "
(اگرچہ میں اپنے آپ کو سرخ انگارے جیسی رضائیوں میں لپیٹ لوں مگر وہ
ٹھنڈے پڑے ہیں یہ میرا جسم۔ یہ میرا سینہ !)
(بیگم کوجو)

" مونو ایو مو
کیکو مو یوروساشی —— الخ "
(جی چاہتا ہے کہ دروازے کو میخیں ٹھوک کر بند کردوں اور اپنے کمرہ
میں تنہا بیٹھکر روؤں کیونکہ مجھ میں نہ قوت کلام ہے نہ تاب سماعت)
(مس ساگا)

" ہانا نو کانی —— الخ "
(اے نیند! میں پھولوں کی خوشبوؤں میں تمناؤں کے ساتھ تجھ تک
پہنچی ہوں۔ اب تو ابدالاباد تک مجھ سے کنارہ نہ کیجیو)
(مس تاچی بانا)

———:———

جاپانی شاعری میں خانگی زندگی کے گل بوٹے بھی ہیں۔ یہ انسانیت کی وہ علامات ہیں جن کو ملک و نسل کا اختلاف متاثر نہیں کرتا۔ مسز اوکاموتو جو مسٹر اپی اوکامتیو مشہور ہجونگار کی بی بی ہیں۔ ان کی چار نظموں کو میں نے یکجا کردیا ہے کیونکہ ان کا موضوع ایک ہی ہے:—

" اسا شیمو یا
کوزینی تو ای تو —— الخ "

(صبح کو جب پالا پڑ رہا تھا مجھے ایک چور پر ترس آیا جو کچھ پیسے اور چاول چرا کر لے گیا)

(مسز هیرو کو کتیاما)

" نیت سوکے ری نو —— الخ "

(شب کے وقت جب مجھے نیند نہ آتی تھی میں نے اپنے پاؤں مچھر دانی کے ٹھنڈے دامنوں سے ملنے کی کوشش کی)

(مس مات سو موتو)

" رومینا نارو واری نی کاواری تی مونو کاؤ
توکیمی اوی یوکینو سمیوکی توتومونی
کائے نارے نو ایو تسو کا —— الخ "

(مجھ عورت کے بجائے سردی میں بازار سے سودا خریدنے وہ گیا ھے۔اس کو خرید و فروخت کا تجربہ نہیں اس لئے غالباً وہ ایسی حالت میں گھر لوٹے گا کہ اس کے کپڑے پانی میں شرابور ھوں گے اور کوئی چیز خریدی نہ ہوگی—

وہ جس کو بازار کا کچھ تجربہ نہیں ھے کچھ پیاز خرید کر لایا ھے اور میں جب ان ڈالیوں کی سفیدی کو دیکھتی ھوں تو مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آتا ھے۔

وہ ان کو اپنی پوٹلی کے سرے پر سے نکلنے سے نہ روک سکتا تھا اور پیازوں کی جڑیں پوٹلی کے باھر نکلی پڑ تی تھیں)

(مسز اوکامیڈو)

——:():——

اس میں فطرت کی جھلکیاں بھی جابجا نظر آتی ھیں اور بعض سنی ھوئی یا دیکھی ھوئی چیزوں کے اثرات دل میں گھر کر جاتے ھیں:—

" مائی او جو وا —— الخ "

(صبح کا ستارہ اس طرح تنہا رہ گیا ھے کہ گویا اسے کہیں جانا ھی نہیں ھے اور بادخزاں چل رھی ھے)

" یو تو نیر یبا —— الخ "

اس نظم کا میرے ایک شاگرد نے حسب ذیل ترجمہ کیا تھا:—

جب رات آتی ھے اور خاموشی سے ڈھکی ھوئی دنیا مسحور ھو جاتی ھے تو میں پہاڑ کے چشمہ کو پرانی کہانیاں گنگناتے ھوے سنتی ھوں—

(مسز یوسا نو)

" چی وا ھی تو تسو —— الخ "

(سورج برت میں سے نکل رہا تھا اور زمین ایک بڑا سفید کنول بنی ہوئی تھی۔

(مسز یوسانو)

"نیوری تی ساکو —— الخ"

(اے ابابیل ! کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ستون سے لگا ہوا اس طرح سے جھکا ہوا کھڑا تھا جیسے بارش میں گل چینی کھل کے لٹک پڑتا ہے)

(مس اساوھارا)

"پانا تو پانا —— الخ"

(حیرت ہے کہ یہ ہلکے ارغوانی اور سرخ رنگ کے پھول جو ایک دوسرے کے آگے گردنیں مٹکاتے ہیں تو یہ ایک دوسرے سے کیا کہا کرتے ہیں !)

(بیاکورن)

"اوموکی کے زی —— الخ"

(شب کے وقت سڑک پر سخت آندھی چل رہی تھی اور میں اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں سے یہ محسوس کرتی تھی کہ گویا سخت زلزلہ آگیا ہے)

(مسز ماسکو چینو)

"اریسو نو —— الخ"

(سینتا گا ھانا کے ساحل کی ریتی پر موجیں پھیل پھیل کر روشن چاندنی میں ایک ہنگامہ بپا کر رہی ہیں)

(مسز کشی کو واکا یاما)

"کیورو کومو وا —— الخ"

(وہ سیاہ بادل کا ٹکڑا —— میرے دل کے لئے کتنا مسرت بخش نظارہ ہے کہ پر غضب سورج تک پر چھاگیا اور اٹھلاتا ہوا سامنے سے نکل گیا)

(مسز هراتا)

——:0:——

مذکورۂ بالا نظموں میں تخیل کی جو پرواز نظر آتی ہے اسی نے بعض دوسری نظموں میں ایک مغربی رنگ اختیار کر لیا ہے:—

"کیورو کی سورا —— الخ"

(گہرے نیلگوں آسمان پر سبز مریخ اس طرح چمک رہا ہے کہ گویا اژدھے کی آنکھ میری موت کی خواستگار ہے:—

(مسز میسا کو چینو)

"واکا کی هی وا —— الخ"

(نوجوانی کے عالم میں بہت سی ایسی باتوں کا شوق ہوتا ہے جو آسان نہیں۔ مثلاً کہکشاں کے نیچے رات بسر کرنا)

(مسز یوسا نو)

" رونا چو مایوای ——— الخ "

(اس تیس سال کے عرصے میں میں ایک تنگ راستے پر اس ملک میں گشت کرتی رہی جس کو عورت کہتے ہیں)

(مسز ہیرا کوکتا یاما)

" ہے جیرو نو ——— الخ "

(ایک رات خواب میں ایک ضعیف عورت نے جس کے کپڑے خاکستری رنگ کے تھے آکر میرے بالوں میں غم کا پھول اٹکا دیا)

(مسز میسا کوچینا)

———:O:———

ہر ملک میں عورت کی شاعری کا مرد کے مقابلے میں زیادہ پتے کی اور جذبات تنہائی کے بہتر ترجمان ہونا لازمی ہے - ولیم شارپ جب آخر کار اپنے آبائی زمانہ کے تکلیف دہ انکشافات میں مصروف ہوا تو اس نے اپنی شخصیت کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر فائنا مک لیوڈ کا بھیس بھر لیا تھا۔جاپان میں مرد مغربی خیالات و مغربی جذبات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن عورتوں کے قلوب کی جڑیں اس وقت تک قدیم تخیل کے تاریک و عمیق کووں تک پہنچتی ہیں۔اس میں شک نہیں کہ تغیر ان میں بھی ہو رہا ہے اور مختلف حالتوں میں اس کی کیفیت مختلف نظر آتی ہے جیسا کہ مذکورۂ بالا نظموں کے ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے - اس شاعری کے میدان میں جو خود قوم کے برابر وسیع ہے۔گو مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بیگم کوجو قدیم حس و متانت کو ہاتھ سے نہ دینے میں معیار قرار دی جاسکتی ہیں۔ان کے حسرت بھرے اور شیریں اشعار میں وہ درد پایا جاتا ہے جو بارہ صدی کی جاپانی شاعری کی شاید سب سے پائے دار خصوصیت ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کے کلام میں رضا بقضا کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جو بطور خود دلکش تو ہے ہی مگر مذہب کی آمیزش اس کے حسن کو اور ہی دوبالا کر دیتی ہے:—

" یاروسی نیکی ——— الخ "

(میں نے ایک نقصان پر اپنے دل کو تسکین دی اور اپنے سینے پرونے میں مصروف ہوگئی اور بڑے بوڑھوں نے میری تعریف کی)

" یوگا سومی ——— الخ "

(ایسے وقت جب کہ شام کی دھند مغرب کی پہاڑیوں کو ڈھانپے ہوتی ہے-میں اپنی خلوت میں افسوس کیا کرتی ہوں)

" ھو ھو ایمیتی ——الخ "

(میں آج تمام دن مسکرائی اور سب میں بیگم بنی رہی)

" راکو جی تسو وا——الخ "

(وہ ڈوبتا سورج! یہ کسی سورما کی روح ہے جو شعلہ یا خون کی چڑھتی موج نظر آتا ہے!)

(بیگم کوجو)

——:o:——

اس خاتون کی شاعری کی زیادہ تر دلکشی ان چیزوں پر مبنی ہے جن کو یہ غیر مذکور چھوڑ دیتی ہے اس کیف سکوت پر جس میں اس کے اشعار ڈوبے ہوتے ہیں اور نیز اس تعلق کی احساس آفرینی پر جو ہمیں اپنی موجودہ زندگی کے عمیق تر علم سے محسوس ہونے لگتا ہے-یہی عنصری وجدان بعض دوسری شاعرات حاضرہ کے کلام میں بھی صراحتاً اور کہیں کنایتاً پایا جاتا ہے :—

" واگا تاما وا——الخ "

(کئی سال ہوے کہ میری روح بادیہ پیمائی کے لئے گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی)

(بائی اکیورن)

" توری مو ناکازو——الخ "

(کوئی پرندہ اس وقت نہیں چہچہاتا-آج ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے-البتہ میری روح کی ہلکی ہلکی آواز آسمان میں سنائی دے سکتی ہے)

(مسز ہیراکوکتایاما)

" آوکی پانا——الخ "

(جب تمہارے سانس سے میرے بال ہلنے لگے تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ آسمان میں نیلے پھول کھل رہے ہیں)

(مسز میساکوچینو)

" ساکی نو یو نو——الخ "

سامنے دور سے چمکتا ہوا سمندر اس طرح نظر آرہا ہے کہ گویا آئندہ عالم میں بھی میرا گھر ہو گا اور مجھے اپنی طرف کھینچ لے گا)

(مسز تاکاکویازاوا)

——:o:——

زور حاضرہ کی شاعرات میں مسز یوسانو جنکی کچھہ نظمیں میں نقل کرچکا ہوں بہت مشہور ہیں-ان کی شہرت کی زیادہ تر یہ بھی وجہ ہے کہ ان کے قومی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے-ان کی شادی ایک معلم و شاعر سے ہوئی تھی اور خود اگرچہ اپنے کثیر خاندان میں گھری رہتی ہیں مگر اس کے باوجود اپنے علمی ادبی کاموں کے لئے وقت نکال لیتی ہیں جن پر ایک مغربی خاتوں بھی فخر کرسکتی ہے-ان کی نظمیں خصوصیت کے ساتھہ تازہ اور پر مغز ہوتی ہیں ان کے کلام میں اکثر زمانۂ ماضی کے کسی خواب سے بیدار ہونے کی-منظر عام-توقع-یا کسی قدیم باغ میں نئے پھولوں کے کھلنے کی کیفیت ہوتی ہے:—

" کاکو نی یو وا —— الخ "

(چونکہ زمانۂ سلف کی دنیا سمندر سے بھی زیادہ گہری ہے اس لئے کوئی موتی یا مونگا میرے ھاتھہ نہیں آتا)

" ھی نو یاما مو —— الخ "

(کوہ آتش فشاں کی آگ دب جاتی ہے اور سمندر کی موجیں خاموش ہوجاتی ہیں مگر عشق کے زور کا کیا کیا جائے ؟)

" ھی تو فو کو نو —— الخ

(نو روز کے دن دوپہر کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل معمے جو آدم کے بچوں کو پریشان کرتے ہیں حل ہوگئے تھے)

" یاوا ھاوا نو —— الخ "

(تم نیکی کا تو وعظ کرتے رہتے ہو مگر نرم جلد میں گرم خون کی روانی کو کبھی محسوس نہیں کرتے)

مسز یوسانو)

——:0:——

غرض اس قسم کی نظمیں آج کل ٹوکیو کی مشہور شاعرات کے قلم سے نکلتی ہیں-اگر کوئی شخص ان رسالوں میں سے بہترین نظمیں انتخاب کرتا رہے جو شاعری اور طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے متعلق جاپان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے ہیں تو اس قسم کا ایک کیا بہت سے انتخابات مرتب ہو سکتے ہیں-جاپان کے قریباً ہر حصے سے ایسے رسالہ شایع ہوتے ہیں جن میں منظوم کلام ہوتا ہے-ہر جگھہ ایسے لوگ ہیں جن کو کم از کم ایک عمدہ نظم یاد ہوتی ہے لیکن ایسا کلام مشکل سے دستیاب ہوگا جیسا کہ مس ھائگدی ٹاکا یامایا آنجہانی کا ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:—

"مزو یوری مو —— الخ"

(پانی سے زیادہ ٹھنڈے رنگوں کی پوشاک پہنے ہوئے چاند اپنی سکوت میں دنیا کی خزاں (کا پیام) میرے دل تک پہنچاتا ھے)

اس قسم کی نظم سے ہم کو اس امر کا احساس ہوتا ھے کہ ہماری (انگریزی) زبان کی جدید شاعری کا کتنا بڑا حصہ ان پر سکون جاپانی تصورات سے جداگانہ نوعیت اور مختلف قدر و منزلت رکھتا ھے- حقیقت میں جاپان کی خاص شاعری کا انگریزی نظم کے بعض بہترین حصوں ھی سے مقابلہ کیا جاسکتا ھے—

جب ہم صریحی اور ظاہری پہلو سے قطع نظر کرکے ان عمیق و دقیق انکشافات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو شاعری کی ترقی اور عظمت کی خاص علامات ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہوتا ھے کہ ان کے دو سب سے اعلیٰ اور نا قابل انفکاک عناصر اولیہ ہوتے ہیں- یعنی لحن اور استعارہ ہیں- انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وجود کے نازک تر حسیات سے آخری خطاب کیا جاتا ھے- یہی ہم میں عروج کی وہ قدرتی شناخت پیدا کر دیتے ہیں جو تمام فنون لطیفہ کا معیار ھے- چونکہ جاپانی شاعری میں بعض غیر ضروری صوری پابندیاں ہیں اس لئے عالم کی وسیع تر پیچیدگیوں کا آئینہ ہونے کی حیثیت سے اس کا انگریزی شاعری سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا - لحن و استعارہ دونوں عالم کی غیر متناہی بوقلمونی کو یکرنگ و ہم آہنگ بنانے کا ذریعہ ہیں- ٹانکا کے محدود دائرے میں قدیم جاپان کی رسمی و رواجی زندگی اور اس سے بچنے کی خواہش سے ایک معتدبہ حصہ کا اظہار ہوتا ھے- اس سخت پابندی کے ٹوٹنے اور قوم کے دلوں میں تازہ ہواؤں اور پریشاں کن آندھیوں کے آنے کے باعث اب نسبتاً بڑے اوزان رواج پاتے جاتے ہیں- بے قافیہ نظم کا طوفان یہاں بھی وہی کام کریگا جو اور ممالک میں کرچکا ھے- یعنی شاعر قدیم و جدید اصناف شعر میں حقیقی شاعری کی طرف زیادہ متوجہ اور مصروف ہوجائیں گے —

اب جو لوگ ان لیلیٰ وشوں کی طرح- جنکی نظموں کے یہاں یکجا کرنے کا فخر مجھے نصیب ہوا ھے- قدیم رواج کے مطابق اوتا لکھنا پسند کرتے ہیں وہ خود ہمارے شعرا کے ساتھ ان انسانی خصوصیات میں ثبوت نسبت دیتے ہیں جن کو ہماری شاعری استعارات میں ظاہر کرتی ھے:—

Look how a bright star shooteth from the sky;
So glides he in the night from the Venus' eye.

اسی طرح وہ خاتون جس کو ہم بائی اکیورن کے نام سے جانتے ہیں تخیل میں وہ چونکا دینے والی وحدت پیدا کردیتی ھے جس کا کالرج نے اپنے ایک یادگار قطعے میں ذکر کیا ھے:—

" واکا کاتا نی ——— الخ"

(ایک ستارہ میری طرف دوڑتا ہوا آتا ھے- شاید مجھے کوئی ایسی خوشی ہونے والی ھے جو آج تک کسی کو نہ ہوئی ہوگی)

اگر ان استعارات و تشبیہات کا مطالعہ کیا جائے جن کو مغربی شعرا اپنے کلام میں لاتے ھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ اس حسن کو بے نقاب کرتے ھیں جو شاعر کو بے خودی کے عالم میں متاثر کرتا ھے اور شعر کہتے وقت وہ اس سے کام لیتا ھے-اس قسم کا مطالعہ ہم کو شاعر کی شخصیت اور اس کے ذاتی امتیاز سے واقف کر دیتا ھے-

اوتا کے عمدہ نمونوں کو ہم اس قسم کے انگریزی اشعار سے تشبیہ دے سکتے ھیں جن کی مثال ٹنی‌سن کے مندرجۂ ذیل مصرعوں سے بہتر بہ مشکل میسر آئے گی:—

Short swallow flights of song that dip
Their wings in tears and skim away.



بحرالمحبت (مصحفی)

(از مولوی عبدالساجد صاحب)

:O:

رسالۂ اردو جلد اول نمبر ۴ (اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ ع) میں میرا ایک مضمون " مصحفی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی " کے عنوان سے نکلا تھا-جس میں میں نے اپنے پاس کے قلمی نسخہ کے مطابق مصحفی کی مثنوی بحرالمحبت تمام و کمال مع اپنے حواشی کے نقل کردی تھی-رسالۂ اردو میں اس کی اشاعت سے ایک مقصود یہ بھی تھا کہ اگر کسی صاحب کے پاس مثنوی مذکور کا کوئی دوسرا نسخہ موجود ہو تو مجھے اطلاع ہوجائے لیکن جب کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو سال بھر کے انتظار کے بعد آخر سنہ ۱۹۲۲ ع میں مثنوی مذکور کو علیحدہ کتابی صورت میں مع مقدمہ و دیباچہ اور حواشی میں اضافۂ مزید کے مطبع معارت (دارالمصنفین) اعظم گڈھ سے شایع کردیا-اب چند روز ہوئے خوش قسمتی سے ایک دوسرا نسخہ دستیاب ہو گیا-جس کی بنا پر طبع اول میں بعض ترمیمات ضروری ہوگئی ہیں-کتاب مذکور کو چونکہ بعض یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب درس میں داخل کرلیا ہے اس لئے تصحیح کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی ہے—

یہ نسخہ جناب شاکرحسین صاحب نکہت سہسوانی کی ملک ہے اور جناب سید محفوظ علی صاحب بدایونی کی وساطت سے مجھے ملا-ان دونوں صاحبوں کی عنایت کا شکریہ ضروری ہے-نسخہ خط نستعلیق میں بد خط لکھا ہوا ہے- ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر ۱۸ صفحہ کی ضخامت ہے-جابجا کرم خوردہ ہے-مگر زاید نہیں-درمیان کے دو صفحہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کے معلوم ہوتے ہیں-طریق املا وہی خصوصیات رکھتا ہے جن کا آج سے سو برس ادھر عموماً رواج تھا-مثلاً " آ " کو " اا " لکھنا-" گ " پر ایک ہی مرکز لگانا-دو علیحدہ لفظوں کو ایک میں ملا کر لکھنا مثلاً "حق‌میں" کے بجاے " حقمیں ") وقس علیٰ ہذا-املا میں متعدد فاحش غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً—

"صعوہ"	کے بجائے	"صعدہ"	لکھا ھے	(شعر ۳۴)
"پرتاب"	..	"ترباب"	..	(شعر ۱۹۳)
"جرخ"	..	"جزع"	..	(شعر ۳۲۰)
"پدید"	..	"برید"	..	(شعر ۱۷۸)
"پروا"	..	"پرواہ"	..	(شعر ۱۸۰)
"مثنوی"	..	"مسنوی"	..	(خاتمہ)

عنوان پر بجاے معین نام کتاب کے یہ الفاظ ھیں:-"مثنوی بحرالمحبت مصحفی به جواب دریاے عشق میر تقی"-خاتمہ پر یہ عبارت تحریر ھے:—

"مثنوی در جواب دریاے عشق میر محمد تقی صاحب سلمہ من کلام میاں مصحفی صاحب سلمہ اللہ تعالی-نوشتۂ عاجز خاکسار گنہگار مہر علی بیگ به وقت سه پہر به روز پنجشنبه به تاریخ بست وھشتم تمام شد سنه ۱۲۲۵ ھجری—

نوشته به مانند سپه بر سفید—— نویسنده را نیست فردا امید

هرکه خواند دعا طمع دارم—— ز انکه من بندۂ گنہگارم"

سنه کے اعداد کی کتابت زرا مشتبه معلوم ھوتی ھے-یعنی شبه ایسا ھوتا ھے که بعد کو کسی دوسرے شخص نے انہیں لکھا ھے-لیکن میر تقی کے نام کے ساتھه "سلمہ" کا اضافه ھے-جس سے معلوم ھوتا ھے که وقت کتابت وہ زندہ تھے اور ان کا سنه ۱۲۲۵ ھجری تک زندہ رھنا مسلم ھے-اس لئے یه شبه زیادہ قوي نہیں رھتا-سنه و تاریخ کے اندراج کے ساتھه مہینه کا ذکر نه ھونا بھی زرا کھٹکتی ھوئی بات ھے—

یه نسخه جسے سطور ذیل میں میں نسخۂ ب سے موسوم کروں گا متعدد حیثیات سے اس نسخه سے جس کو میں نے شایع کیا ھے اور جس کے لئے سطور ذیل میں نسخه الف کی اصطلاح ھوگی مختلف ھے-ب کا سال کتابت سنه ۱۲۲۵ ھجری اگر صحیح ھے تو گویا الف کے سال کتابت سنه ۱۲۴۱ ھجری سے وہ سوله سال قدیم ھے-اور ب کی عبارت خاتمه اس امر کو ثابت کررھی ھے که مصحفی نے میر کی دریاے عشق کا جواب انہیں کی زندگی میں تیار کرلیا تھا-ب کے عنوان اور خاتمه دونوں کی عبارتوں میں "جواب دریاے عشق میر تقی" موجود ھے-اس سے معلوم ھوتا ھے که تالیف کے وقت اس کی "جوابی" حیثیت مخفی و مشتبه نہیں بلکه اچھی خاصی نمایاں تھی-الف میں یه جوابی حیثیت نمایاں نہیں-اس کے آغاز میں صرف اس قدر عبارت ھے-"مثنوی میاں مصحفی سلمہ که برطبق مضمون مثنوی دریاے عشق که از میر تقی مرحوم است گفته اند"-"برطبق مضمون" اور "در جواب" کا مفہوم ظاھر ھے که بالکل متحد نہیں-الف میں اشعار پر نمبر میں نے ڈال دئے ھیں-ان میں جن اشعار میں میر تقی کے حق تقدم و فضیلت کا اعتراف کیا گیا ھے اتفاق سے

ب میں وہ اشعار یا تو سرے سے غایب ھیں مثلاً اشعار نمبر ۳۵۲ تا نمبر ۳۵۶ اور یا اس شعر میں میر کا نام مسخ ہو گیا ھے۔مثلاً شعر نمبر ۹ الف میں یوں درج ھے—

گرچہ ھے کلک میر نادرکار تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار

ب میں مصرعۂ اولیٰ ان الفاظ کے ساتھہ ملتا ھے:—

گرچہ ھے کلک مرد نادرہ کار

ب کے دستاب ہونے کے بعد الف میں جو جو ترمیمات ضروری ہوگئی ھیں ان کے لئے تو ناظرین کو مثنوی کے طبع ثانی کا انتظار کرنا چاھیے-البتہ ذیل میں میرے مطبوعہ نسخہ اور ب کے اختلافات کی فہرست درج کردی جاتی ھے- جو اختلافات بالکل واضح سہو کتابت یا سوء کتابت کا نتیجہ تھے انہیں میں نے قلم انداز کر دیا ھے-بہت سے مواقع اختلاف پر میں اسی خواندگی کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مطبوعہ نسخہ میں موجود ھے-تاھم بہت سے مواقع پر ب کی خواندگی قابل قبول ھے-ذیل میں محض دونوں خواندگیوں کے اختلافات کی فہرست درج کی جاتی ھے-محاکمہ اور تعئین صحت کا یہ موقع نہیں—

نمبر شعر	عبارت نسخۂ مطبوعہ	عبارت نسخۂ ب
عنوان	مثنوی بحرالمحبت	مثنوی بحرالمحبت مصحفی بہ جواب دریاے عشق میر تقی
۷	طراحیوں	طراضیوں
۷ مصرعہ اولیٰ	کھنچا	کھچا
۷ مصرعہ ثانیہ	لکھا	کہا
۸	بھی	تو
۹	ھے کلک میر نادر	کلک مرد نادرہ
۱۰ مصرعہ اولیٰ	میں	پہ
۱۰ مصرعہ ثانیہ	حسن	رنگ
۱۱	سے	پہ
عنوان	آغاز داستان آں جوان	× (جگہ چھوٹی ہوئی عبارت غایب)
۱۴	داغ پر داغ	گھاؤ پر گھاؤ
۱۵	چڑھی تھیں	چڑھیں تھی
۱۸	سھنون	مجنون

٢٥	کہ کسی کوچہ میں جو جا نکلا	ایک کوچہ سے جو جا نکلا
	اس کے بھی دل کا مدعا نکلا	اس کے دل کا بھی مدعا نکلا
٢٦	دل تھا اس کا جو	دل جو تھا اس کا
٣٠	لگ کے	تک کے
٣١	مژہ سے ہو کے بہا	ہو مژہ پہ بہا
٣١	کچھ نہ اس کا	اس کا کچھ نہ
٣٩	میں وو ہیں	وہیں سے
٤١	گیا	گئی
٤٤	بسکہ	یوں جو
٤٤	صرت	حرت
٤٥	پہ	پے
٤٩	لوہو	لہو
٥١	بندہ	بحر
٥٢	حسرت	حیرت
٧٣	دھائے	ڈھائے
٩٣	چشم	تیر
٩٥	ہمدم	مونس
١٠١ مصرعۂ اولی	ہے	ہیں
١٠١ مصرعۂ ثانیہ	اب عذاب ہے	کے عذاب ہیں
١٠٥	ہی	بھی
١٠٨	چھوتا	چھٹتا
١١٥	دل	جی
١١٧	جب نہ بن آئی	نہ بن آئی جب
١١٧	یہی سوچے	پھر یہ سوجھی
١٢٥	رات دن رہے تھے	رہتی ہے بہت ہی
١٣٦	واں سے	وہاں
١٣٧	چل	تو
١٣٨	سچ ہے	سمجھے
١٣٨	اس کا	ادنی
١٤٢	وہ	یوں
١٤٢	چشم و التفات	چشم التفات

۱۴۳	وحشت	دهشت
۱۴۴	اس	ان
۱۴۴	اسیر	سفیر
۱۴۵	دابه وحشت	دل کی دهشت
۱۴۷	مین	په
۱۴۷	کو	کے
۱۵۰	کس	جس
۱۵۳	سے	میں
۱۵۷	راه کز	ره که از
۱۵۷	باد	باؤ
۱۵۸	دیکھے	دیکھوں
۱۵۸	مذلتیں	اذیتیں
۱۶۱	رخصت	حضرت
۱۶۲	کرکے ناله به طرح	رکھه کے ناله په طرح
۱۶۳	کاے	که
۱۶۳	جی	اس
۱۶۶		(شعر غایب)
۱۶۷	هوئے معض	هو وه عشوه
۱۶۸	جاے بار	جان زار
۱۷۰ مصرعۂ اولیٰ	تغافل	تجاهل
۱۷۰ مصرعۂ ثانیه	تجاهل	تغافل
۱۷۳	کاے	اے
۱۷۵	سے	کو
۱۷۵	فرقت	فرصت
۱۷۶	جو	سو
۱۷۷	هم و ثاقی	وهم باقی
۱۷۹	آبس اب	بس اب اس
۱۸۰	مل هی	هی مل
۱۸۶	جو یاں	جو یوں
۱۸۷	وه	یه
۱۹۱	به	در

۱۹۲	خاصه	خاص
۱۹۳	بتر	شریر
۱۹۳	ابتر	ابثر
۱۹۴	خاکساروں	عشقبازوں
۱۹۵	تہا سب کو	یہ تہا سب
۱۹۸	کو	اور
۱۹۹	نزار	زار
۲۰۰	واں ھی آ	یہ بھی واں
۲۰۳ — ۲۰۸		(کل اشعار غایب)
۲۰۹	محشر	حشر
۲۱۲	ڈوبے تھے کتنے	ڈوبی تھی کشتی
۲۱۳	تہ	بر
۲۱۵	دید	دیدہ
۲۱۶		(شعر غایب)
۲۱۷	وہ	کچھہ
۲۲۲	اس کے سے کی جو کفش نے	سے اس کے کفش نے کیا
۲۲۴		(شعر غایب)
۲۲۸	طے کیا	پہنچا
۲۲۹	ھوا	ھو کے
۲۳۲	عقل	خلق
۲۳۳	اس	ان
۲۳۴	لینے پہ	لینا یہ
۲۳۷-مصرعہ ثانیہ	لیا	کیا
۲۴۳	اس صنم کو پار	پار اس صنم کو
۲۴۳	وحشت	حیرت
۲۴۵	رہ گیا	ھوگیا
۲۵۰-مصرعہ اولی	صحبت	خلوت
۲۵۰-مصرعہ ثانیہ	خلوت	صحبت
۲۵۰-مصرعہ ثانیہ	ان کو	اس کو
۲۵۳		(شعر غایب)
۲۵۸	سے	یہ

۲۵۹	رھیں	گئیں
۲۶۴	رہ	وھی
۲۶۴	میرے	اپنے
۲۶۵	کوآلے	سودا لے
۲۶۷	سر	دل
۲۶۸	آتا	آئے
۲۶۹	بیٹھی	مٹی
۲۷۰		(شعر غایب)
۲۷۱	دایہ نے یوں کہا	بولی یہ دایہ اے
۲۷۲		(شعر غایب)
۱۷۴		(شعر غایب)
۲۷۸		(شعر غایب)
۲۸۱		(شعر غایب)
۲۸۲		(شعر غایب)
۲۹۴	منہ کو اپنے ملتے	اپنے منہ کو مل کے
۲۹۸		(شعر غایب)
۲۹۹	میں (مکرر)	پر (مکرر)
۳۰۲	پر وہ خستہ ڈوبا تھا	تھا وہ خستہ دل ڈوبا
۳۰۳	گہ (مکرر)	پر
۳۰۴	بہ مرا دم رسم تہ گرداب	اور وہ سردم رہا بے گرداب
اضافہ	——	کفش پر میری جی دیا اس نے
		یا الٰہی یہ کیا کیا اس نے
۳۰۷	میں	کو
۳۱۴	کوئی	یک
۳۱۵	دایہ غافل تھی	دایۂ غافل
۳۱۶	تیری	تیرا
۳۱۷	ھی	تھا
۳۲۲	لے کے پاوں سے	لپٹیں بالوں کے
۳۲۵	منہ	سہ
۳۳۰	ہوئے (مکرر)	ہوا
۳۳۵	لب	آب

ادب



بانگ درا

اقبال اس وقت اردو کے سب سے مقبول اور اعلی شاعر ہیں-ان کا کلام اب تک متفرق تھا اور ایک جا جمع ہوکر شایع نہیں ہوا تھا-ان کے کلام کے دلدادہ اس سے مطمئن نہ تھے اور ایک مدت سے منتظر اور مشتاق تھے کہ سارا مجموعہ کتاب کی صورت میں شایع ہو جائے-کس قدر مسرت کی بات ہے کہ وہ آب دار موتی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں-جن کی جوت سے آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے—

کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے ''ہمالہ'' ہے-کوہ ہمالہ ہندوستان کی شوکت و شان کا نشان اور اس کے حفظ و امن کا پاسبان ہے-ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے-جس شاعری کی ابتدا ''کوہ ہمالہ'' ہو اس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لئے اس میں نیک شگون پاتا ہوں-وہ محاسن جو بعد میں ہم نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اقبال کے کلام میں نکالے ان سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں-تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہےہیں-لیکن سب سے بڑی بات جو ہم اس میں دیکھتے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حب وطن کی بو آتی ہے-اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بھی بڑھتی جاتی ہے-چند ہی صفحوں کے بعد ''صداے دل'' کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم ہے-شاعر درد دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بد نصیبی پر آنسو بہاتا ہے—

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ھے غضب
ایک ھی خرمن کے دانوں میں جدائی ھے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ھوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اس کے نیچے ھی ھندؤں کے مقدس منتر گایتری کا ترجمہ ھے جو اس قدر پاک خیال کیا جاتا ھے کہ غیر برھمن کے کان میں اس کی آراز تک پہنچنا ناجائز سمجھا جاتا ھے۔گویا جس اخوت کی انہیں تلاش تھی اس کے لئے پھولوں کا ایک ھار گوندھا ھے۔چند نظموں کے بعد سیدکی طرح تربت ھے جس پر یہ ھدایت درج ھے—

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ھے بیٹھا ھوا ھنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ھوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

اس سے ذرا آگے ایک اور نظم "تصویر درد" آتی ھے جو درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ھے اور شاعر نے دل کھول کے اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ھے—

رلاتا ھے ترا نظارہ اے ھندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ھے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ھیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ھیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

---:o:---

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ھے
تری بربادیوں کے مشورے ھیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ھو رھا ھے ھونے والا ھے
دھرا کیا ھے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ھو اور تیری صدا ھو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ھندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ھوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی نظم کے ایک بند میں کس حسرت سے یہ شعر کہا ہے—

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اور کیا خوب کہا ہے—

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

اسی نظم میں ایک شعر ہے جو ملک کی اس وقت کی حالت کا صحیح نقشہ ہے-

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

چند ہی ورق اولٹنے کے بعد "ترانۂ ہندی" آتا ہے جسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید ہے کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے-عام و خاص-عالم و جاہل سب کی زبان پر جاری تھا-اس کا ایک ایک لفظ حب وطن میں ڈوبا ہوا ہے—

اس کے بعد ہی "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے جو وطن کی محبت کا راگ ہے اور جس کا پانچواں مصرعہ یہ ہے-"میرا وطن رہی ہے میرا وطن وہی ہے" یہ گیت ختم ہوتے ہی ایک اور نظم آتی ہے جس کا نام "نیا شوالہ" ہے-یہ شاعر کے انتہاے کمال کا نمونہ ہے-اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے-یہ وہ نظم ہے جو ہر انجمن اور ہر کانگریس کے ہال میں سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے اور ان کے اسٹیجوں پر بجاے بدنما کرسیوں اور میزوں اور مہمل اور بے معنی آرائش کے نیا شوالے کی تعمیر ہونی چاہئے جہاں ہر پرستار وطن کا سر جھک جائے اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو-اس نور کی جھلک ہر مذہب میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی تکمیل کسی نے نہیں کی-ہر زمانے میں ایسے پاک نفس اور حق پرست لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اتحاد و محبت کا بیج بونا چاہا لیکن ان کی کوششیں تھک کر ایک فرقے میں محدود رہ گئیں-شاعر ان تمام فرقہ سازیوں اور فرقہ بازیوں کو مٹانا چاہتا ہے-ہر انسان جو تعصبات اور روایات کے گرد و غبار سے الگ ہو کر انصاف کے ساتھ غور کریگا تو اسے وہ حقیقت نظر آئیگی جہاں شاعر کی نظر پہنچی ہے-لیکن تعصبات پھر غالب آجاتے ہیں-

اور آئینۂ دل کو مکدر کر دیتے ھیں- میں یہ نہیں کہتا کہ جہاں شاعر پہنچا ھے وھاں تک کوئی اور نہیں پہنچا- بیشک بعض لوگ وھاں تک پہنچے ھونگے لیکن انہیں اظہار حق کی توفیق نہیں ھوئی- اقبال نے اس حقیقت کو بلا خوف ملامت ظاھر کر دیا- لیکن اس پر قائم کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ھے- ھم اس وقت جو جو جتن ملک میں محبت و اتحاد قائم کرنے کے لئے کر رھے ھیں وہ سب اوپری اور عارضی ھیں- حقیقت سے دور اور حق سے نا آشنا ھیں- وحدانیت اور اتحاد کا راز نئے شوالے میں ھے—

نئے شوالے کے ساتھہ ھی اقبال کی شاعری کا پہلا دور ختم ھوتا ھے- اس دور کا نام میں نے حب وطن رکھا ھے- دوسرے دور آغاز اس مجموعے کے دوسرے حصہ سے ھوتا ھے جسے میں نے حب ملت کے نام سے موسوم کیا ھے- اس کی ابتدا سنہ ۱۹۰۵ع سے ھوتی ھے- یہ وہ زمانہ ھے جب وہ انگلستان تشریف لے گئے ھیں- انگلستان ھمارے نوجوانوں کی کسوٹی ھے- ان کے اصل جوھر وھاں جا کر کھلتے ھیں- ان کے لئے وہ ایک نیا عالم ھوتا ھے- جدید تمدن کی روشنی بعض اوقات ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ھے کچھہ دنوں کے بعد جب سنبھلتے ھیں تو اپنے امتحانات کے دھندے میں لگ جاتے ھیں اور اس سے جو وقت بچتا ھے وہ نئی لطف اندوزیوں میں بسر ھو جاتا ھے- کچھہ ایسے بھی ھوتے ھیں جن کے دلوں میں وطن کی لو لگی ھوتی ھے وہ طرح طرح کے منصوبے گھڑتے اور وطن کی خدمت کے لئے نئے نئے خیالات سوچتے ھیں- بعض تو نہر سویز تک پہنچتے پہنچتے دھیمے پڑ جاتے ھیں اور کچھہ جو ثابت قدم رھتے ھیں شروع میں یہاں آکر ھاتھہ پاؤں مارتے ھیں لیکن وہ چنگاری جو سات سمندر طے کر کے سلگتی ھوئی آئی تھی گرد و پیش کے حالات اور صحبتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بجھہ کے خاک ھو جاتی ھے- البتہ اکا دکا ایسا نکل آتا ھے جو با وجود موانعات کے کام کرتا رھتا ھے اور کچھہ کر گزرتا ھے- گو کہنے کو وہ امتحانوں کے لئے انگلستان جاتے ھیں لیکن اصل امتحان ان کا ھندوستان میں ھوتا ھے جس میں اکثر ھیٹے نکلتے ھیں- اس کا دوس تنہا انہیں پر نہیں بلکہ ھمارے ملک کی حالت- تعلیم کا طریقہ- گھروں کی صحبت- انتخاب کی غلطی اور اسی قسم کے اور اسباب بھی اس کے زمہ دار ھیں اور ان کو الزام دینا ھی غلطی ھے- وہ نہ اس خیال سے جاتے ھیں اور نہ ان خیالات کو لیکر آتے ھیں- وہ جس غرض سے جاتے ھیں اسے کچھہ نہ کچھہ حاصل کر ھی لیتے ھیں- لیکن اقبال کا جانا اس عام گلے کا سا جانا نہ تھا جو ھر سال یہاں سے جہاز بھر کر دیار مغرب کو جاتا ھے- وہ ایسے وقت گئے تھے جب کہ ان کی طبیعت اور سیرت میں پختگی آچکی تھی- ملک کی حالت سے واقف اور زمانے کے تیور پہچان چکے تھے- دل میں حب وطن کی لو لگی ھوئی تھی- ملک میں ان کا کلام مقبول ھو چکا تھا اور اقبال کا ترانہ اور وطن کے گیت دیس کے گلی کوچوں میں گائے جا رھے تھے- یورپ میں ان کی آنکھوں نے کیا کیا تماشے

دیکھے۔کیا کیا خیالات دل میں موجزن ہوئے۔کیسے کیسے منصوبے سوچے۔کیا کیا سامان اپنے ملک کے لئے جمع کئے۔کیسے کیسے ارادے تھے جو دل ھی دل میں رہ گئے۔یاد وطن نے کس کس طرح بیقرار رکھا اور اپنی قوم کی پستی کو دیکھہ کر دل پر کیا کیا صدمے گزرے اور اس کے ابھارنے کے لئے کیا کیا ولولے پیدا ھوئے ؟ ان کا جواب یا تو وہ خود دے سکتے ھیں یا ان کا کوئی رازدار دوست۔لیکن اس زمانے کے کلام کے پڑھنے سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ نئے مشاھدات اور خیالات نے ان کے دل میں ایک جوش اور تلاطم پیدا کر رکھا ھے جن کے اظہار کے لئے وہ بیتاب اور مجبور ھیں-ان خیالات کو انہوں نے اس نظم میں موزوں کیا ھے جو شیخ عبدالقادر صاحب کے نام ھے جو یورپ میں ان کے ھم سفر-ھم مشرب و ھم راز تھے-یہ گویا ان کی آئندہ زندگی کا پروگرام ھے جس پر وہ خود عامل ھونا چاھتے ھیں اور دوسرے کو عمل کرنے کی ھدایت کرتے ھیں-اس خط کے یہ دو شعر ان کے دردِ دل کو ظاھر کرتے ھیں—

گرم رکھتا تھا ھمیں سردئی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

انگلستان کے قیام کے زمانے اور اس کے بعد کے کلام سے دو باتیں خاص طور پر معلوم ھوتی ھیں جنھوں نے ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا ھے-ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں مکڑی کے جالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ھے اور بنی نوع انسان کے حق میں سم قاتل ھے اس پر انہوں نے بڑی بڑی کاری ضربیں لگائی ھیں-ان کے یہ شعر مشہور اور زبان زد خاص و عام ھو گئے ھیں---

دیار مغرب کے رھنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ھے!
کھرا جسے تم سمجھہ رھے ھو وہ اب زر کم عیار ھوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ھی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ھوگا

دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر چھایا ھوا ھے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ھے سخت بیزار ھیں-وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لئے باعث ھلاکت اور موجب آفت خیال کرتے ھیں چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر دنیا پر نازل ھوئی اس کا بدیہی ثبوت ھے-اس بیزاری کا نتیجہ یہ ھوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ھوتے ھیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو

بے روح اور صداقت سے خالی ہے انہیں اس عقیدے پر اور مستحکم کردیتی ہے۔اس طوفان سرمایہ‌داری و استبداد میں انہیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافی حدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالا ہے—

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اسی خیال کو دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان کی ان کوششوں کو جو ملک کے محب وطن اتحاد پیدا کرنے کے لئے کر رہے ہیں مسلمانوں کے حق میں ایسی ہی ہیچ و پوچ سمجھتے ہیں جیسے مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کی کوششیں اتحاد عالم کے لئے۔چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہوجا

اور یہی وجہہ ہے کہ انہوں نے ”ترانۂ ہندی“ کے جواب میں ”ترانۂ ملی“ لکھہ کر اس کے اثر کو کم کرنا چاہا جو ان کے اختیار سے باہر تھا۔اس کے بعد ”وطنیت“ کی نظم میں کھلم کھلا اپنے عقیدے کا اعلان کردیا ہے اور مسلمانوں کو اس تازہ آفت سے بچنے کی ہدایت کی ہے کہ وطن پرستی بھی بت پرستی ہے—

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس کے بعد کہتے ہیں—

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھہ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھہ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ ان خیالات کو بار بار اس سے زیادہ جوش اور حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس سیاسی وطن کو اصول اسلام کے خلاف بتاتے ہیں۔ان کی نظروں میں قرون اولے کا سماں سمایا ہوا ہے۔وہ وہی سادگی۔حمیت۔ایثار اور اخوت چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ مسلم اپنی قدر اور اسلام کی حقیقت سمجھے۔وہ فخر کائنات ہے اور یہ زمانہ جو صداقت سے بیگانہ ہے ان اصول کا منتظر ہے جو اسلام کی تعلیم مین پنہاں ہیں—

دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا   حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا
میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے   میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

وہ نصاری وضع اور ہنود سیرت مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتے۔وہ مغربی تہذیب اور اس کی رعنائیوں میں منافستہ اور خرد فروشی۔اس کی جمہوریت میں استبداد۔اس کے آئین میں قیصریت دیکھتے ہیں۔اشاعت تعلیم و تہذیب کے دعوے۔اصلاح و تنظیم کی مجلسیں۔حقوق و مراعات کی قرار دادیں دھوکے کی ٹٹیاں ہیں جن کی آڑ میں مغرب کا فرمانروا اقوام عالم کا شکار کھیلتا ہے۔لیکن یہ سب تدبیریں اور حکمتیں ناپائدار ہیں۔عنقریب مٹنے والی ہیں۔دنیا بہت جلد ان سے تنگ آجائیگی اور بری طرح انتقام لے گی۔اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس رمز کو سمجھ جائیں آنے والے دن کے لئے ابھی سے تیار ہو جائیں۔ان میں پھر وہی پہلی سے اسلامی حرارت پیدا ہو۔وہی عزم اور ولولے ہوں۔وہی مساوات اور اخوت ہو۔ان کی منتشر جمعیتیں ایک شیرازے میں بندھ جائیں مختلف فرقے اور مختلف اسلامی دولتیں ایک ہوجائیں۔تاکہ وہ دنیا کی رہنمائی کرسکیں۔دنیا اپنی حالت سے بیزار اور اپنے آئین سے تنگ آگئی ہے۔وہ خودکشی پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ایسی حالت میں اگر کوئی آڑے آسکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔کیونکہ دنیا ایسے نظام کی منتظر ہے جو سرمایہ داری سے پاک ہو۔جس میں حاکم و محکومیت کا کوئی امتیاز نہو۔جہاں امیر و غریب ایک ہوں۔جسکی تہذیب میں نفسانیت اور تعلیم میں دنائت نہو جس کا خدا ایک۔جس کا آئین ایک۔جس کا خیال ایک اور جس کا مطمح نظر ایک ہو۔اور جو شروع سے آخر تک توحید ہی توحید ہو اور کہیں دوی کا نام نہو۔ایسا نظام سوائے اسلام کے اور کونسا ہو سکتا۔وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ اسلام کا بول بالا ہوگا دنیاکی اقوام اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونگی۔اس کی پاک تعلیم سے پرانا ناسور مندمل ہوگا۔امن و امان اور اخوت و مساوات کا دور ہوگا۔اس وقت سچا مسلم اقوام عالم کا امام اور اس جہاں کا خلیفہ ہوگا۔یہ ہے وہ آرزو جو ہمارے شاعر کے

دل میں موجزن ہے اور جس پر اس نے اپنے فلسفہ اور شاعری کی ساری قوت صرف کردی ہے-

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائیگا
ترک خر گاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کے مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑگیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں—

یہ نکتہ سر گزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

ایک چھوٹی سی نظم تین بیتوں کی مذہب پر لکھی ہے جو یہ ہے

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نکر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دین ہاتھہ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ملت نہ وطنیت پر ہے نہ قومیت و نسل پر بلکہ مذہب پر ہے-اس کی قوت اور اتحاد سیاست یا قانون پر نہیں بلکہ دین پر- مذہب ان کے شیرازۂ اتحاد کو جو اب ڈھیلا پڑگیا ہے مضبوط کریگا-اسی کی بدولت سب مختلف اور منتشر قوتیں ایک جا ہوں گی اور اسلامی ملت ایشیا کی نہیں سارے عالم کی رہنما اور امام ہوگی-ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور سرمایہ داری اور استبداد-سیاست اور رقابت کا خاتمہ ہوجائے گا-یہ ہے اقبال کا خواب جس کی تعبیر پردۂ خفا میں ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے مذاہب یا اقوام سے نفرت کرتا ہے یا ان سے تعصب رکھتا ہے-نہیں- بلکہ اس نے رام- نانک-سوامی تیرتھہ رام پر بھی ایسی ہی سچائی اور جوش سے نظمیں لکھی ہیں جیسے اپنے پاک نفس بزرگوں کے لئے-معلوم ہوتا ہے کہ مدت کے غور و فکر اور تجربہ کے بعد اس نکتے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی اقوام کی یکجہتی کی بنیاد سوائے ملت اسلام کے بودی اور خلل پذیرہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سوائے ملت اسلام کے کسی قوم کو دنیا کی خلافت کا اہل نہیں سمجھتے-انہوں نے جو کچھہ اس بارے میں لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ خلوص- صداقت اور جوش سے بھرا ہوا ہے-وہ عاشق و شیدائے اسلام ہے اور عاشق کو ہر جرم معاف ہے—

غالباً یہی وجہ ہے کہ آخر آخر میں ان کا میلان طبع فارسی کی طرف زیادہ ہوتا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے خیالات آسانی سے ممالک اسلام میں شایع کرسکیں اور ملت اسلام کو ایک جمعیت بنانے میں مدد دے سکیں۔کیونکہ جب اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو شاعر کی درد بھری آواز لوگوں کے مردہ دلوں میں کھولن پیدا کرتی ہے اور انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔جناب شیخ عبدالقادر صاحب نے اس مجموعے کے شروع میں ایک پر لطف دیباچہ لکھا ہے جو صرف شیخ صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔اس میں انہوں نے اقبال کے کلام پر تنقید نہیں کی بلکہ ان کی شاعری کا نشوو نما اور تدریجی ترقی دکھائی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔اس میں فرماتے ہیں "دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا۔یعنے اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعۂ خیال بنا لیا" اس کے شیخ صاحب نے کئی اسباب بتائے ہیں۔جنہیں میں انہیں کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتا ہوں—

"فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب حالات تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہوگا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہوگئے۔مگر بظاہر جس چھوٹے سے موقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدہ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمایش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہوگیا"—

شیخ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں جائے دم زدن نہیں۔بیشک یہی

اسباب فارسی کی طرف ان کے میلان طبع کے ہوئے ہوں گے۔ لیکن جس چیز نے مستقل طور پر فارسی میں کہنے کی طرف مائل کیا وہ وہی خیال ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنے ملت اسلام کے افتراق و نفاق کو دور کرکے اسے ایک قوی جمعیت بنانا جس کی بنا خالص اسلام پر ہو۔اسے کاہلی اور نکبت سے نکال کر عمل اور جد و جہد کی طرف مائل کرنا۔اہل ملت میں وہ سیرت اور خلوص پیدا کرنا کہ ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں شمع ہدایت ہو اور بالاخر انہیں اقوام عالم کی سرداری اور امامت کے لئے آمادہ کرنا۔ یہ تعلیم ان کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے خواہ وہ کسی ملک اور کسی نسل کے ہوں۔۔

لیکن ہند کے مسلمان عجیب کش مکش میں ہیں۔جب حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ نشۂ دولت سے ذرا ہوشیار ہوئے تو ہادی نے انہیں یہ ہدایت کی کہ دول اسلام سے تعلق یا محبت رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ادھر اہل وطن سے یک جہتی دشوار ہے کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ اور ہم کم ہیں۔اگر رہے تو ان کے تابع ہوکے رہنا پڑیگا۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ انگریزوں سے جو فرمارواے ملک ہیں مل کر رہو۔اسی میں تمہاری خیر اور تمہاری زندگی ہے۔ایک مدت اسی پر کار بند رہے۔ لیکن سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں۔یہ طلسم بھی ٹوٹ کے رہا۔اس کے بعد رموز سیاست کے شناسا اور زمانے کے نباض آئے اور ہدایت فرمائی کہ اگر ہمیں عزت کے ساتھ زندہ سلامت رہنا ہے تو اہل وطن سے یک جہتی اور اتحاد پیدا کریں ورنہ ملک ہمیشہ پامال رہے گا اور ملک والے کبھی غلامی سے نہ نکل سکیں گے۔سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک صلح و آشتی کی لہر دوڑنے لگی۔اتحاد واتفاق کے ترانے گائے جانے لگے اور لوگوں کے سینے صلحکاری اور محبت کے نور سے معمور نظر آنے لگے اور یہ معلوم ہوتا تھاکہ گویا ایک مدت کے بعد اس ملک پر خدا کی رحمت نازل ہونے والی ہے۔مگر ساتھ ہی یہ بھی تلقین تھی کہ اگرچہ حب وطن ایمان ہے لیکن اسلامی ریاستوں سے محبت و ہمدردی کا تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔ہندؤں نے بھی اسے تسلیم کیا اور عالی ظرفی سے ساتھ دیا۔ دونوں بچھڑے بھائی پھر مل گئے اور اخلاص و محبت سے رہنے لگے۔نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی کہ پھر پھوٹ پڑ گئی اور چار دن کی چاندنی کے بعد پھر اندھیرا گھپ ہوگیا۔ خدا ان بزرگوں کی ہمت میں برکت دے جو اب تک اس اتحاد کے پیدا کرنے میں سچے دل سے ساعی ہیں۔اب ہندو اپنی تنظیم الگ کر رہے ہیں اور مسلمان الگ فکر میں ہیں کہ اپنی جمعیت درست کریں۔ بہر حال کچھ دنوں کے لئے یہ کھکھیڑ ان کی قسمت میں اور لکھی ہے۔ ٹھوکریں کھاکر ایک دن رستے پر آہی جائیں گے۔۔

یہ سیاست دانوں اور ملک کے رہنماؤں کی تدبیریں تھیں۔شاعر اور حکیم

کی صدا ان سے نرالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وطنیت کا خیال ہیچ و پوچ ہے۔ سیاست ایک قسم کی عیاری ہے۔ تہذیب و آئین مغربی غول راہ ہے۔ اس لئے انہیں چاہئیے کہ وہ ان پھندوں میں نہ پھنسیں وہ مذہب کو رشتۂ اتحاد بنائیں۔ وہ خصائل اور اخلاق پیدا کریں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھے اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو تیرہ صدی پہلے انہیں دئے گئے تھے اور اس پاک تعلیم کے زور ایشیا کی رہبری کریں اور پھر ایک بار عالم پر چھا جائیں کیونکہ دنیا کی نجات اسی میں ہے۔ یہ ہے اقبال کا پیام ملت اسلام کے نام اور سنہ ۱۹۰۵ ع کے بعد سے اس آواز میں زیادہ گونج اور قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ بہت اعلیٰ خیال ہے اور مسلمانوں کے لئے بہت خوش آیند ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ اس خیال کی شدت کہیں ہمیں ہندوستان سے غافل نہ کر دے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جو دلی محبت ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ہم اسے جنگ بلقان اور خلافت کے معاملے میں خوب دیکھ چکے ہیں۔ لیکن کیا ان کو بھی ہندی مسلمانوں سے ایسی ہی محبت ہے؟ ہندی ہر خطے میں حقیر سمجھا جاتا ہے اور غلام سے زیادہ اس کی وقعت نہیں۔ ہندی مسلمان کی خود اسلامی ممالک میں کوئی وقعت نہیں۔ جب تک ہم اس ملک میں جہاں رہتے ہیں اپنی حیثیت مضبوط نہ کرلیں اور جب تک ہم یہاں آزادی خیال اور آزادی عمل کو حاصل نہ کرلیں ملی اتحاد کا خیال خواب ہی خواب ہے۔ اگر مسلمان ملک کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش ملکی اتحاد و ترقی میں جد و جہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو انہیں اس ملک میں رہنے کا کیا حق ہے؟ وہ لوگ کیا دوسروں کی مدد کرسکتے ہیں جو بے اجازت اپنے ملک سے قدم باہر نہیں رکھہ سکتے اور جو بے اذن کسی عملی ہمدردی کے قابل نہیں ہیں؟ جب ہم اپنے ہی ملک میں بیگانہ اور آپس کے تفرقوں کے شکار ہیں تو دوسروں کے سامنے کس منہ سے اتحاد کی تعلیم پیش کریں —

تاہم اقبال کے پیام میں بلندی اور ایسا خلوص اور جوش ہے کہ وہ رائگاں نہیں جاسکتا۔ وہ سوتوں کو جگانے۔ غافلوں کو ہوشیار کرنے اور دلوں کے ابھارنے میں بجلی کا سا کام کریگا۔ اس کا مقصد سیاست یا ملک گیری نہیں بلکہ وہ اخلاقی اور روحانی پیام ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیم پر ہے اور جس کی غرض اسلامی اصول اور آئین کی اشاعت ہے جو اتحاد ملی کے ذریعہ سے دنیا پر کارفرمائی کرسکتے ہیں لیکن ساتھہ ہی انہیں اپنے "ترانۂ ہندی" کو بالکل بھلا نہیں دینا چاہئیے —

وہ خود فرماتے ہیں —

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

مگر افسوس کہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا جاتا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں صرف عجمی خم اور حجازی بادہ ہی نہ رہ جائے اور اس خیال کی تصدیق مجھے اس شعر سے ہوئی جو بعد کا کہا ہوا ہے—

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

لیکن اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔اس لئے ہم اس درخواست میں شیخ عبدالقادر صاحب کے ساتھہ شریک ہیں "کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق ہے۔خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے—

گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائے دل سوزی پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑہ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے نکلوایا تھا اس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھہ عرصہ کے لئے گیسوے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں" یہی نہیں کہ اردو ان کے خیالات سے محروم رہ جائے گی بلکہ ان کا پیام جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے ہیں تشنہ اور اثر سے محروم رہ جائے گا—

اقبال کی شاعری یا ان کے پیام پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قدامت پرستی کی طرف مایل کرتی ہے اور بجائے آگے قدم بڑھانے کے وہ ہمیں صدیوں پیچھے لے جانا چاہتی ہے۔لیکن اس کی انہیں مطلق پرواہ نہیں بلکہ اس پر خوش ہیں اور ایک گونہ فخر کے ساتھہ خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں—

ہاں یہ سچ ہے۔چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئنے میں فردا کو میں

لیکن ان کی قدامت پرستی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اداسی پیدا کرتی ہے۔بلکہ وہ ان اصول کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے۔وہ اپنے پیام میں عہد ماضی کی روشن مثال دکھاکر بار بار انہیں عمل اور جدوجہد اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے—

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ ادا کیا ہے :—

اس رہ میں مقام بے محل ہے   پوشیدہ قرار میں اجل ہے

یہی خیال اس شعر میں بھی ہے:—

مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو   زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے

کوشش نا تمام کے متعلق کہتے ہیں :—

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ کام سے   زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے

اس سے بڑھ کر کوئی کیا کہہ سکتا ہے :—

وائے نادانی ! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو۔ مینا بھی تو۔ ساقی بھی تو۔ محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیراللہ کو
خوف باطل کیا ؟ کہ ہے غارت‌گر باطل بھی تو
بے خبر ! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال کی شاعری کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے شمع اور شاعر۔ خضرراہ اور طلوع اسلام کی نظمیں غور سے پڑھنی چاہئیں۔ یہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی دوسری نظمیں اس پایہ کی نہیں ہیں۔ ان کی بعض چھوٹی نظمیں بہت پاکیزہ اور اعلے درجہ کی ہیں۔ مثلاً ایک آرزو ۔ سرگزشت آدم۔ جگنو۔ چاند۔ صبح کا ستارہ۔ پرندہ اور جگنو وغیرہ بہت اچھی اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

تخیل کی بلندی۔ تشبیہات و استعارات۔ لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ اقبال کے کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوق سخن ہے باسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرز ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں مگر شان و شکوہ۔ زور اور شور امنڈتے ہیں۔ جذبات کی ادائی حکیمانہ نظر اور شاعرانہ انداز بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو—

آگ ہے۔اولاد ابراہیم ہے۔نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

گویا ہزارہا سال کے تاریخی تجربوں کے نچوڑ کو دو مصرعوں میں پیش کردیا ہے—

شاعروں نے بہار و خزاں کے سمے اور گل و بلبل کے راز و نیاز بیان کئے ہیں۔ اقبال نے صحرا کا سماں لکھا ہے۔ چند شعر ہیں مگر کس قدر بلند اور کیفیت پیدا کرنے والے:۔

اے رہین خانہ تونے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضاے دشت میں بانگ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوے چشم جہاں بین خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل
تازہ ویرانے کی سوداے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یا اس شعر کو دیکھئے۔کیا خیال ہے اور کیا قوت بیاں:—

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہوکہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر زرہ کا دل چیریں

میرا مقصد اس وقت اقبال کے منتخب اشعار کا پیش کرنا نہیں ہے اور نہ یہ اس کا موقع ہے اور نہ مسلسل نظموں میں سے بعض اشعار کا انتخاب مناسب ہے۔جسے ان کے کلام کا لطف حاصل کرنا ہو وہ کم سے کم ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں جن کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں—

آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخر ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ٹیگور کے کلام میں بیشک پریم کا رس گھلا ہوا ہے۔اس کی محبت عالم گیر ہے۔وہ تمام کائنات کو اپنے آغوش محبت میں لینا چاہتا ہے۔اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے۔لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے۔ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت

گہرا اور بے تھاہ ہے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔اقبال کا مطمح نظر اگرچہ مقابلتاً محدود ہے مگر زیادہ قوی۔زیادہ پرزور اور زیادہ شور انگیز ہے۔ٹیگور کے ہاں نازک سے نازک موقع پربھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لئے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔وہاں جذب و کیف کے ساتھ خود داری ہے اور یہاں وارفتگی و شیفتگی—

باہر کجا کہ اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

لیکن اگر وہ ایک لحظہ کے لئے ذرا مڑ کر دیکھیں تو ہم انہیں ان کا "نیا شوالہ" دکھانا چاہتے ہیں جس کی قسمت میں تعمیر سے پہلے کھنڈر ہونا لکھا تھا۔گو اقبال اس وقت ایک دوسری شاندار تعمیر میں مصروف ہیں لیکن ایک روز انہیں ادھر آنا پڑیگا اور وہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہوگا—



دیوان حسرت

(حصۂ پنجم۔ششم۔ہفتم۔ہشتم۔نہم)

مولانا حسرت موہانی ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں ملک کا ہر شخص جانتا اور بوجھتا ہے۔اگرچہ اس وقت ان کی سیاسی جدو جہد نے ان کی شاعری کو دبا لیا ہے لیکن آیندہ ان کی شاعری ہی ان کی بقا کا باعث ہوگی۔یہ پانچ دیوان جو مولانا نے ہمیں عنایت فرمائے ہیں ان میں کا اکثر حصہ زمانۂ قید یازمانۂ گرفتاری کا لکھا ہوا ہے اور اس لئے اس کلام میں خاص لطف ہے۔اگر ہم اسے "زمزمۂ مرغ اسیر" کہیں تو بجا ہے۔حسرت اس وقت غزل گو شعرا میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ان کے کلام کی پختگی صفائی اور شیرینی قابل تعریف ہے۔اگرچہ ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کبھی رکیک زبان یا خیال نام کو نہیں آتا۔انہوں نے غزل کا پایہ بلند کردیا ہے اور اپنے خاص انداز میں سیاست کی چاشنی سے غزل کا لطف بڑھادیا ہے۔حسرت نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور باوجود سیاسی اور دیگر مشاغل کے وہ کبھی اس سے غافل نہ رہے۔باوجودیکہ ان کی شاعری کا دائرہ غزل کے حدود میں رہا لیکن انہوں نے صحیح ذوق پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔جو لوگ شیریں اور بے عیب کلام اور پاک صاف اور شستہ زبان کے شائق ہیں وہ

حسرت کا کلام ضرور مطالعہ کریں—

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا
میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

حصۂ پنجم ہفتم اور نہم کی قیمت چار چار آنے - حصۂ ہشتم کی چھ آنے اور حصۂ ششم کی آٹھ آنے ہے - "بیگم صاحب حسرت موہانی - حسرت روڈ - کان پور" سے مل سکتے ہیں-



ارتنگ خیال

مولوی سید ضامن علی صاحب ضامن کنتوری کے دیوان کا پہلا حصہ ہے - جناب ضامن کہنہ مشق و پختہ گو شاعر ہیں اور قدیم طرز سخن میں بہت خوب کہتے ہیں- آپ کا کلام اردو کے اکثر رسائل میں مدتوں چھپتا رہا ہے اور کچھ زیادہ تعارف کا محتاج نہیں ہے - جناب ضامن مولانا حبیب کنتوری مرحوم کے خلف و تلمیذ رشید ہیں- آپ کے کلام میں پختگی اور کہنہ مشقی کے علاوہ قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدت مذاق بھی ایک حد تک نمایاں ہے - اس دیوان میں رسم قدیم کے موافق (۱۷۴) صفحہ تک ردیف وار غزلیں ہیں - اس کے بعد اور اصناف کلام کے نمونے نظر آتے ہیں - اس دیوان میں ایک جدت شعرا کے لئے قابل تقلید یہ ہے کہ ہر غزل پر سال تصنیف لکھ دیا ہے - اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کون غزل کس زمانے کی ہے - اگر تاریخ وار ہی ترتیب ہوتی تو بہت زیادہ بہتر ہوتا - اس سے یہ اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے کہ مشق سخن میں شاعر نے بتدریج کیا ترقی کی ہے اور کس زمانے میں مذاق سخن کیا اور مشق سخن کا عالم کیا تھا - ارباب دیوان یہ امر ملحوظ رکھیں تو یہ بہتر جدت ہوگی

جناب ضامن مرزا بیدل اور مرزا غالب کے اس رنگ میں کہنے کی زیادہ کوشش فرماتے ہیں جس کو مشکل پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے - چنانچہ اشعار غزل میں (حالانکہ ہمارے خیال سے صرف وہ زبان ہونا چاہئے جو میر اور سوز و درد نے اختیار کی ہے) ثقیل - غریب - مغلق الفاظ اور غیر مانوس ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں اور بعض جگہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ ہی کے لئے شعر کہا گیا ہے نہ یہ کہ اپنے بلند پایہ خیالات کو ادا کرنے کے لئے شاعر یہ الفاظ لانے پر مجبور رہا ہے - مثلاً فرماتے ہیں—

توہم فطرتی ہے وجہ غفلت ورنہ انساں کو
دل ہر ذرہ مجلائے شط نور یقیں ہوتا

اس میں شک نہیں کہ مقصود شاعر بہت خوب ہے - جو تعلیم وہ دے رہا ہے عین انسانیت کی تعلیم ہے مگر مغلق تراکیب و الفاظ نے مزہ کھو دیا - یا مثلاً —

جو ہوتا دل کو ذوق نغمۂ ساز حقیقت کچھہ
طنین پشہ کانوں کو سرور را مشیں ہوتا

یا دکھائیں وہم نے کیا کیا ڈراؤنی شکلیں
خیال غیر کا پتیارۂ مہیب ہوا

یا وہ تمثال فنا ہوں صفحۂ ارتنگ ہستی پر
کہ مجھہ سے پہلے اڑجانے کو ہے رنگ اثر میرا

جوشش رحمت حق دیکھئے کیا کرتی ہے
ابر بن کر تتق حسرت سائل ہوگا

اسی طرح "پتیارۂ مہیب" "صفحۂ ارتنگ ہستی" "تتق حسرت سائل" کی ترکیبیں اگرچہ صحیح ہیں مگر خوشگوار۔مانوس اور فصیح یقیناً نہیں ہیں۔اس غرابت و ثقالت سے قطع نظر کیجے تو اکثر غزلوں میں بہت عمدہ عمدہ اشعار ملتے ہیں۔مثلاً

چارہ جب ہو نہ سکا عقل کی بیماری کا
نام رکھا گیا تقدیر خطاکاری کا

اور بھی ایسے اشعار ہیں جن میں زمانے کو بہترین تعلیم عمل دی ہے اور یہ درس کنایات میں بہت خوب کام کرتا ہے۔ضامن صاحب اور فرماتے ہیں—

کوشش سے بن ہی جائے گی کوئی نہ کوئی شکل
یہ مدعا ہے گردش چاک کلال کا

ذیل کی غزل نہایت پاکیزہ و دلکش ہے۔اس کا مزہ ہم تقریباً سولہ سترہ برس سے لے رہے ہیں جب کہ یہ مرحوم اردوے معلی علی گدہ کے اپریل نمبر سنہ ۱۹۰۷ ع میں شایع ہوئی تھی۔فرماتے ہیں—

سودائے زلف ضامن بہر خدا نہ کرنا
سر پر بلا نہ لینا دل پر جفا نہ کرنا
بیتابیے محبت اک شعبۂ جنوں ہے
میرے کہے سنے پر تم اعتنا نہ کرنا
رنگ پریدۂ رخ تفسیر بے دلی ہے
عرض نیاز الفت اس کے سوا نہ کرنا
جیتے ہیں جینے والے مرتے ہیں مرنے والے
عاشق کے غم میں دیکھو تم زلف وا نہ کرنا

اس غزل کے تقریباً تمام شعر بہت خوب ہیں اور ایک شعر سنیے—

دیتا ہے دل کو لطف نوا ہائے راز کا
نغمہ صریر خامۂ معنی طراز کا
کچھہ اور بڑہ گئی ہیں ادھر بے نیازیاں
الٹا اثر پڑا یہ فسون نیاز کا
ایک عرصۂ دراز سے وہ سنگ آستاں
ہے سجدہ گاہ میری جبین نیاز کا

عرصۂ دراز کی ترکیب کے جواز میں شک ہے کیونکہ عرصہ بہ معنی مدت فارسی کلام میں نظر سے نہیں گزرا-شاید جناب ضامن کوئی سند رکھتے ہوں شعر بہت پاکیزہ ہے —

سر مست تماشا ہوں وہ جلوہ مقابل ہے
لبریز مئے حیرت مینا کدۂ دل ہے

جناب ضامن کا کلام پختگی کے علاوہ زبان و فن کے اغلاط سے پاک ہے-یہ سب سے بڑی خوبی ہے جس کی اس ہڑبونگ کے زمانے میں بہت کم امید کی جا سکتی ہے- کہیں کہیں بہ تقاضائے بشریت کچھہ سقم نظر آتے ہیں-مگر وہ چنداں قابل گرفت نہیں

مثلاً ہمیشہ جام تھا اس خمکدے میں اپنا تہی
سرور ہی نہیں آیا خمار کیا ہوگا

مصرعۂ اولیٰ میں ہمیشہ جام تھا-خلاف محاورہ اہل زبان ہے ایسے موقع پر- ہمیشہ سے تھا یا ہمیشہ رہا بولتے ہیں-اس خیال کے صحیح ہونے کا بڑا ثبوت یہ اصول ہے کہ نظم کو نثر کر کے دیکھہ لیا جائے تو فوراً پتہ چل جاتا ہے-ایک اور شعر ہے

چشم ظاہر بیں ہے کیا مسحور افسون نمود
دوسرا رخ تو کوئی دیکھے کبھی تصویر کا

پہلے مصرعہ میں یہ معنوی سقم معلوم ہوتا ہے کہ جب مسحور کا لفظ موجود ہے تو افسون کا لفظ زائد اور حشو ہوگا-مسحور نمود کہنا کافی تھا کیونکہ افسون کے معنے لفظ مسحور میں خود موجود ہیں —

کس قدر ہے مری جانب سے کدورت یا رب
اشک بھی ان کے تصور میں مکدر نکلا

آنسو اور اشک کا صیغۂ واحد کے ساتھہ استعمال جو-ایک اور ہر کے ساتھہ ہوتا ہے-ورنہ جمع ہی بولتے ہیں-یہی اچھا معلوم ہوتا ہے —

جیسے جو اشک آنکھوں سے آتا ہے سو بہتا بانہ آتا ہے
گر کے دامن پر بنا ہر اشک تصویر بہار

یا (فقرہ) اس کی آنکھہ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا-ان تین صورتوں کے علاوہ

اشک اور آنسو جہاں تک خیال ہے بہ صورت جمع ہی مستعمل ہوتے ہیں—

موج بال افشانیسے بلبل ہے طغرائے بہار
ہونے دیجے گل کہاں تک خود نما ہو جائے گا

یہ ردیف یہاں ٹھیک نہیں ہے۔خود نما ہوگا یا خود نما ہوتا ہے۔محل و مقام کے لحاظ سے چاہئے۔ہونے دو گل کہاں تک خود نما ہوگا یا ہونے دو (دیکھیں) گل کہاں تک خود نما ہوتا ہے—

ٹپکا پسینہ ان کے رخ بے مثال کا
لبریز تھا چھلک گیا ساغر جمال کا

یہ مطلع بہت خوب ہے۔مگر میرے نزدیک ایک یہ معنوی سقم ہے کہ وہ ساغر جو بادۂ جمال سے لبریز تھا چھلک گیا تو یقیناً حسن رخ دوست کچھ کم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ ساغر جمال (رخ محبوب) سے شراب حسن چھلکتی ہے۔حالانکہ یہ خلاف حقیقت ہے۔ پسینہ ٹپکنے سے حسن میں کوئی کمی نہیں آتی اور نہ اسے ساغر جمال کا بادہ کہہ سکتے ہیں—

بعض بعض جگہ ایسے الفاظ بھی استعمال میں آگئے ہیں جو متروک سمجھے جاتے ہیں۔ہم خوش ہیں کہ ضامن صاحب نے اس کی پروا نہیں کی اور بلا تکلف ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔شاعر کو اس کا حق ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ استعمال موقع و محل سے ہو اور حسن کے ساتھ ہو۔ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کریں تو یقیناً بہت سے عمدہ عمدہ شعر دیوان میں ملتے ہیں۔غزلوں کے بعد صفحہ ۱۷۵ کے بعد سے ۲۵ صفحوں میں مسمطات یعنی دیگر اصناف سخن:۔ترتیب بند۔ترجیع بند وغیرہ ہیں۔پھر قطعات اور جدید طرز کی نظمیں ہیں۔مثلاً دل گم گشتہ کی یاد۔ پھر مجھ کو ہنسنا چاہئے۔نقش قدم۔گرد باد۔حسین ساگر وغیرہ چند تقریظات تقریباً سو رباعیات پر قطعات تاریخ ہیں۔اس طرح یہ دیوان ۲۴۶ صفحات پر ختم ہوتا ہے۔لکھائی چھپائی صاف مگر کاغذ بہت معمولی ہے۔قیمت قسم اول تین روپیہ قسم دوم دو روپیہ ہے زیر تبصرہ دیوان غالباً قسم دوم کا ہوگا۔سر ورق خوش نما رنگین—

جناب مصنف سے گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد۔دکن کے پتے پر منگوائیے۔

(م)

لسکر

تسخیر فرانس

تفضل حسین صاحب ناظر نے شکسپیر کے مشہور تاریخی ناٹک ہنری دی ففتھ کا

ترجمہ اس نام سے کیا ھے۔ان نام نہاد ترجموں سے اگر قطع نظر کرلی جائے جو خون ناحق۔ اسیر حرص۔حبشی غلام وغیرہ کے ناموں سے ھمارے ناٹک کو بدنام اور شکسپیر کے خیالات کو مسخ کرتے ھیں تو یہ چیز اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی ادبی خدمت کہی جاسکتی ھے اور اس لحاظ سے قابل قدر ھے۔اسی قسم کی کوششوں میں ھمارے ڈرامہ کی آیندہ ترقی مضمر ھے—

ترجمہ کو جستہ جستہ پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ قابل مترجم نے اصل عبارت کی پابندی نہیں کی ھے۔جہاں لفظی ترجمہ سے اصلی زور کلام باقی نہ رھتا ھو وھاں یہ طریقہ بہت مناسب ھے۔اس پایہ کے ناٹکوں کے ترجموں میں بڑی چیز یہ ھے کہ الفاظ بے روح نہ ھوجائیں۔بلکہ اصلی مفہوم کو پورے زور کے ساتھہ ادا کریں۔اسی لئے موجودہ آزادانہ ترجمہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا پھر بھی بعض مقامات پر ترجمہ نہ صرف اصلی الفاظ بلکہ اصلی مطلب سے الگ جا پڑا ھے اور یہ چیز کسی قدر اصلاح طلب ھے۔ھم اس کی بعض فروگزاشتوں پر اس امید پر تبصرہ کرتے ھیں کہ آیندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

(صفحہ ۱۱) بادشاہ ھنری۔"تو کیا ھم حق حق اور راست راست فرانس کا دعوی کرسکتے ھیں ؟" یہ ترجمہ کسی قدر بھونڈا ھو گیا ھے۔انگریزی الفاظ With right and conscience کا مفہوم اس طرح بھی ادا ھو سکتا ھے "کہ صداقت اور ضمیر کو ھاتھہ سے دئے بغیر"۔اسی صفحہ پر Warlike spirit کا ترجمہ " روح پر فتوح " کیا گیا ھے۔جنگ کے موقع کو مد نظر رکھتے ھوئے " نبرد آزما " کا لفظ زیادہ موزوں ھوتا—

(صفحہ۱۲) " مغرور فرانسیسیوں کی ناک زمیں پر رگڑ دی "۔ناک رگڑنا فعل لازم ھے اور عاجزی کرنے کے معنوں میں آتا ھے۔سمجھہ میں نہیں آتا کہ اسے متعدی شکل میں کیونکر استعمال کیا گیا۔اور پھر اس جملے کا That could entertain the full pride of France ترجمہ تو یہ ھو ھی نہیں سکتا۔اس کا سیدھا سادھا ترجمہ تو یہ ھے کہ " فرانس کی چیدہ فوجوں کو مصروف بکار رکھا "—

(صفحہ ۱۳) پر Pilfering کے معنی " ذلیل " دیے ھیں۔سرحدیوں کی لوٹ مار کے لئے تو " اچکے " زیادہ اچھا ھوتا—

(صفحہ ۱۳) " اڈورڈ کی شہرت کا ڈنکہ ساری دنیا میں بج گیا " اصل میں الفاظ Prisoner kings زیادہ ھیں جس کا مفہوم بادشہ گیری۔یا بادشاھوں کو گرفتار کرنا ھے۔یہ مفہوم اس ترجمہ میں بالکل نہیں پایا جاتا—

(صفحہ ۱۴) اگزیٹر کی تقریر کا آخری حصہ "مثل موسیقی کے.........الخ"

اصل سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ساز کے مختلف راگوں کی ہم آہنگی کی طرف جو اشارہ اصل میں ہے اس کا لطف ترجمہ میں نہیں ہے —

(صفحہ ۱۸) "قاعدہ کلیہ ہے کہ جب انسان رہتا ہے" ترجمہ کے علاوہ مفہوم بھی غلط ہے -اصل کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب "گھر سے باہر رہتا ہے تو بہت زیادہ خوش رہتا ہے" —

(صفحہ ۱۸) " جن کی آتش باری تیری روح رہے گی "اصل کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے جو انتقام کا کام لیا جائیگا اور جس سے کشت و خون ہوگا -اس کا بار تیری روح پر رہے گا" —

(صفحہ ۷۲) پر پستل اور بادشاہ کی گفتگو کو تقریباً مسخ کر دیا ہے - پستل مسخرہ ہے - لیکن شکسپیر کے مسخرے ہمارے یہاں کے ناٹک کے مسخروں کی طرح نہیں ہوتے - خدا معلوم مترجم صاحب نے پستل کی گفتگو کو خواہ مخواہ قافیہ کا پابند کیوں بنا دیا ہے -کیا جس حالت میں پستل تھا اس حالت میں مقفیٰ گفتگو کی جاتی ہے ؟ پستل کی گفتگو کا ترجمہ جہاں کہیں بھی ہے -بہت کم صحیح ہے -ہم مانتے ہیں کہ انگریزی عامیانہ زبان کا اپنی عامیانہ زبان میں ترجمہ بہت مشکل ہے - لیکن اس سے کیا فائدہ کہ بجائے حقیقی کے اسے مصنوعی اور مہمل بنا دیا جائے —

(صفحہ ۷۳) پر ان جملوں کا " بادشاہ تو میاں مٹھو ہے -ملکہ مرغ زریں- نجیب الطرفین - بلکہ ذوقافیتین- نعلین در بغلین " اگر اصلی عبارت سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے -وفاداری کا رنگ جو اصل میں جھلکتا ہے ترجمہ سے بالکل اڑ گیا ہے -اور اس کی جگہ بے تکا پن اور بیہودہ "ٹھٹھول" نظر آتا ہے —

(صفحہ ۷۶) Children rawly left. کا صحیح ترجمہ بال بچوں کا کچا ساتھ ہے - "بیکسی" میں وہ مفہوم نہیں باقی رہتا اسی صفحہ پر بادشاہ کی گفتگو میں اس جملے سے "ان کو تو اپنے کام سے غرض ہے -ان کے مرنے سے مطلب نہیں" بجائے اس کے کہ بادشاہ آقا اور باپ بری الذمہ قرار پائیں الٹا ان ہی پر الزام عائد ہوتا ہے -حالانکہ اصل کا ترجمہ یہ ہے "کہ ان کی نیت کام کرانے کی ضرور ہوتی ہے -نہ یہ کہ یہ بچارے مر جائیں" ترجمہ سے اس کا مقابلہ کیجئے تو اس کا بالکل برعکس نظر آتا ہے —

(صفحہ ۷۱) " میں اور کفارہ بھی دوں گا - لیکن میں کیا اور میرا کفارہ کیا -ا میں تو بس تیری رحمت کا محتاج ہوں " اس ترجمہ کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں ہے - صحیح ترجمہ یہ ہے " میں اس سے زیادہ بھی کرنے کو تیار ہوں حالانکہ جو کچھ بھی میں کروں وہ اس وجہ سے کم حقیقت ہے کہ ان سب سے کہیں زیادہ خود میری پشیمانی اور توبہ ہے جو تجھ سے رحمت طلب ہے —

(صفحہ ۷۲) ڈافن کی گفتگو "ان کا گرم گرم لہو اچھل کر دشمنوں کی آنکھیں

پھوڑ دے اور ان کے پتے پانی ہوکر آنکھوں کی راہ بہہ جائیں"-فرا ترجمہ ہے-
اصل کا مفہوم ہی غائب ہے-انگریزی عبارت یہ ہے—

That thier hot blood may spin in English eyes,
And dout them with superfluous courage.

یہ طنز ہے اور اس طنز کی جان Superfluous courage ہے-کانستبل نے کہا کہ ہمارے گھوڑے شوق جنگ میں ہنہنا رہے ہیں-ڈافن کہتا ہے کہ ان کے پہلوؤں میں مہمیز بھونک دو تاکہ ان کا زائد از ضرورت جوش خون کی شکل میں اچھل کر انگریزوں کی آنکھوں میں پڑے-مطلب یہ ہے کہ فرانسیسی گھوڑوں میں بھی اتنا جوش ہے کہ وہ کچھ انگریزی سپاہیوں کو مستعار دے سکتے ہیں-اگر مترجم صاحب "فاضل جوش" کا لفظ بھی بڑھادیتے تو مفہوم اصل سے زیادہ قریب ہوجاتا—

(صفحہ ۸۳) Carrions کا ترجمہ "مرداروں" کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا "لاشوں" اس سے غنیمت ہوتا-فلولین کی گفتگو میں ہمیشہ ب کو پ سے بدل دیا ہے جو بجاے اس کے کہ اس کی گفتگو کا صحیح اندازہ دلا سکے عبارت کو مضحک بنا دیتا ہے اصل میں فلولین کہیں-b کہتا ہے-کہیں-p-ترجمہ میں اس پابندی کی کیا ضرورت تھی-دھاتی یا گنواری زبان زیادہ مناسب ہوتی-عامیانہ انگریزی زبان کا بہترین ترجمہ میرے خیال میں مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اپنے "فسانۂ لندن" میں کیا ہے-وتنگھم کی گفتگو پڑھی جائے تو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے-بجاے اس کے کہ اس قسم کی تقریروں کو مسخ کیا جائے مناسب یہ ہے کہ اپنے یہاں کے اسی طبقہ کی زبان استعمال کی جائے-اس سے ترجمہ مضحک نہیں ہوتا اور لطف باقی رہتا ہے—

آخر میں اس قدر اور کہنا ہے کہ ترجمہ ضرورت سے زیادہ آزادانہ ہے-ہم یہ نہیں چاہتے کہ بالکل لفظی ہو-لیکن ایسے کلام کے ترجمہ میں جو کلاسکل ہے جتنے لفظ بھی استعمال کئے جائیں چن چن کر بٹھائے جائیں کیونکہ تقریر کے الفاظ ہی ڈرامے کی جان ہوتے ہیں-انہیں صحیح معنوں میں بولنے والے کے جذبات کی تصویر ہونا چاہئے—

ترجمہ ان خامیوں کے باوجود قابل قدر ہے اور نقش اول ہونے کی حثیت سے بہت اچھا ہے— (و)

مکاتیب امیر مینائی

منشی مفتی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم اس زمانے کے بہت اچھے اور مستند شعرا میں سے تھے-بعض کے نزدیک وہ متاخرین میں سب سے بہتر شاعر خیال

کئے جاتے ھیں۔مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ اور شعر و شاعری میں قدما کی یادگار تھے۔پہلی بات پر ان کے خطوط اور دوسری پر ان کی اصلاح سخن شاھد ھے —

منشی صاحب مرحوم کے رشید اور عزیز شاگرد مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب (مدیر رسالۂ قند پارسی و پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) نے بڑی تلاش اور کوشش سے منشی صاحب مرحوم کے خطوط جمع کر کے پہلی بار سنہ ۱۹۱۰ ع میں شایع کئے اور اب دوسرے بار یہ مجموعہ اضافے اور ترمیم کے ساتھہ شایع کیا گیا ھے —

شروع میں حضرت امیر کے حالات۔وضع و اخلاق و عادات اور تصانیف و تالیفات کا کسی قدر مفصل ذکر ھے۔اس کے بعد چند خوش فکر تلامذہ کا ذکر اور ان کے کلام کی وقتاً فوقتاً جو اصلاح کی ھے اس کے نمونے دئے ھیں۔بعض بعض مقامات پر مرحوم نے اصلاح کی وجہ بھی بتا دی ھے۔یہ اصلاحیں پر لطف ھیں اور ان سے ایک حد تک بصیرت ھوتی ھے۔یہ اصلاحیں صرف زبان کی حد تک ھوتی ھیں۔نفس شاعری سے انہیں کوئی تعلق نہیں ھوتا۔اسی دیباچے میں انہوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ھے جو بلا شبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ھے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ھو سکتی۔ اسی میں داغ و امیر پر بھی محاکمہ فرمایا ھے۔ان دونوں باکمال استادوں کی زندگی ھی میں دو جتھے بن گئے تھے اور اس کا چرچا اب تک چلا آرھا ھے۔اس لئے ممکن نہ تھا کہ حضرت ثاقب اس سے بچتے۔اس تبصرے اور محاکمے کا خلاصہ یہ ھے —

" حضرت کی طبیعت میں جدت کم ھے اور کلام میں سوز و گداز بھی۔البتہ شکوہ الفاظ۔متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ھے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماھر ھیں۔قصائد با شوکت وفر کہتے ھیں اور سخنور با سرمایہ۔صاحب علم و فضل ھیں۔داغ ان اوصاف سے معرا ھیں —

" آخر عمر میں استاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھہ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ھوئے۔تاھم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی۔ واقعی بات یہ ھے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں کر سکتا۔لیکن اسیر کا تلمذ۔اساتذۂ لکھنؤ کی ھم بزمی۔اھل لکھنؤ کے کلام کا پیش نظر رھنا۔پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر۔یہ سب امور مانع ترقی و کامیابی ھوئے۔اگر وہ دلی میں پیدا ھوتے۔دلی کے ارباب کمال کی ھم نشینی میسر آتی۔اساتذۂ دھلی کا کلام سامنے رھتا اور شاھجہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ھوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ھوتے —

" مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کو غزل کی

جان اور اردو شاعری کی روح و رواں کہنا سراسر انصاف ہے-مذاق عام نے اس رنگ سے اپنے آپ کو خوب رنگا اور ہر طرف سے اس پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے گئے—

"اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالامال ہے-بر خلاف اس کے ادنیٰ جذبات اور خیالات مرزا داغ کی شاعری کا سرمایہ ہے-داغ نے عشق سے مراد ہوسناکی اور نفس پرستی لی ہے اس لئے ان کی شاعری میں جذبات عالیہ نہیں ہے- جذبات عالیہ کا تعلق حسن و عشق سے ہے اور داغ کے اشعار خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی سے لبریز ہیں-مرزا کی شاعری ادنیٰ ہے-البتہ زبان ان کے مضمون کے لئے جان ہے-زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ ان کی شراب کو دو آتشہ کر دیتی ہے"—

اس محاکمہ میں ایک بات یہ کہی ہے جو عام طور پر اکثر سخن سنج اصحاب فرمایا کرتے ہیں کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا-اس کا جواب مولانا شبلی مرحوم نے بہت خوب دیا ہے-ان کے الفاظ یہ ہیں—

"اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا-یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے-فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی-انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا-تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں "کہ آراست زلف سخن چوں عروس"-جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں-غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"—

اب رہے شاعری کے دوسرے کمال-سو اس کی نسبت میری یہ عرض ہے کہ اعلیٰ جذبات اور خیالات نہ امیر میں ہیں نہ داغ میں-سوز و گداز سے بھی دونوں کا کلام خالی ہے-حضرت ثاقب نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالامال ہے"-یہ محض شکوہ الفاظ کا فریب اور لفظی ترکیبوں کی نمود ہے-اس میں بعض اوقات اچھے اچھے مبصروں کو دھوکا ہو جاتا ہے-البتہ زبان کی صفائی-محاورات کا بے تکلف استعمال-بیان کی شوخی اور طرز ادا کا بانکپن-یہ ایسی چیزیں ہیں جو داغ کو اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی—

اس کے ساتھ فاضل مولف و مرتب نے داغ و امیر کا کلام بالمقابل دیا ہے-نظم کے انتخاب کے بعد امیر مرحوم کے نثر کے نمونے بھی دئے ہیں-یہ کل حالات اور تبصرے وغیرہ ۱۰۶ صفحے پر آئے ہیں-اس کے بعد مکتوبات ہیں—

خطوط جو بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو لکھے جاتے ہیں وہ لکھنے والے کے خیالات و جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں اور جو باتیں ہمیں کاتب کے متعلق ان تحریروں

میں مل جاتی ہیں وہ اس کی تالیف و تصنیف میں نہیں ملتیں۔اس کی سیرت کا صحیح اندازہ اکثر ان خطوط سے ہوتا ہے۔ان میں وہ اوروں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنے سے باتیں کرتا ہے اور اس لئے حجاب اور رازدلی خیالات اور جذبات کے اظہار میں مانع نہیں ہوتے۔اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کے بہت مایوسی ہوئی۔تقریباً تمام خطوط بے لطف۔بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں۔ہم نے یہ خیال کر کے کہ ایک باکمال استاد کے خطوط ہیں اور اس میں کیسے کیسے جواہر ریزے ہوں گے اول سے آخر تک تمام خطوط پڑھے لیکن ان میں نہ تو زبان کا لطف ہے نہ طرز بیان کی کوئی خوبی ہے۔نہ کہیں ادبی نکات بیان فرماتے ہیں اور نہ کہیں شعر و سخن پر کوئی ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے واقعات و حالات زمانہ پر کسی پہلو سے روشنی پڑے۔ ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلت فرصت کا شکوہ ہے یا پیام و سلام اور خیر و عافیت یا روز مرہ کی بہت معمولی باتیں ہیں۔بیان کرنے والے انہیں باتوں کو بعض اوقات اس طرح بیان کرجاتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر دل مزے لینے لگتا ہے مگر یہاں یہ بھی نہیں۔بعض خط ایسے ضرور ہیں کہ ان میں استفسار پر بعض الفاظ اور محاورات کی صحت اور غلطی پر بحث کی ہے لیکن وہ بھی معمولی باتیں ہیں— کوئی بات ایسی نہیں جس میں کوئی خصوصیت یا جدت یا خاص تحقیق ہو۔لوگ اپنے بزرگوں اور استادوں کی ہر چیز کو مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں۔عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔تنقید اپنی نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف ادھر منہ پھیر لیتا ہے۔جو صاحب آئندہ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں انہیں بہت دیکھ بھال کے بعد ہاتھ ڈالنا چاہئے اور ملک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہئے جو فضول اور بیکار ہوں—

البتہ ان خطوط سے دو باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ ان کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور ان سے منشی صاحب مرحوم کو دلی تعلق تھا اور بعض بعض شاگردوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ان کی خوشی سے خوش ہوتے اور ان کے دکھ سے انہیں دکھ ہوتا۔دوسرے امیر اللغات کی تالیف میں بڑا انہماک تھا۔مگر افسوس کہ کافی امداد بہم نہ پہنچنے سے اس کی تکمیل کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی—

ان خطوط سے کہیں زیادہ مفید وہ حصہ ہے جو حضرت ثاقب نے ابتدا میں منشی صاحب مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کے تبصرہ وغیرہ پر لکھا ہے۔اس سے ہمارے قدیم شعرا کے خیالات۔ان کی صحبتوں۔شاگردوں سے ان کے تعلقات۔ان کی شاعری اور اصلاح کے طریقوں سے آگاہی ہوتی ہے۔کیونکہ یہ رسمیں اور طریقے اب اٹھتے جاتے ہیں اور آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب ان چیزوں کی تلاش ہو گی—

کتاب کے کل صفحے ۴۰۴ ہیں۔ کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی بہت معمولی۔ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے دو روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے —

خواجہ حسن نظامی صاحب کی جدید تالیفات

خواجہ صاحب بھی اس زمانے کے عجائبات میں سے ہیں۔ ایک طرف تو وہ شیخ اور صوفی ہیں اور بقول خود ساٹھ پینسٹھ ہزار مریدوں کے مرشد و رہنما ہیں۔ دوسری طرف وہ مولف و مصنف بھی ہیں اور مصنف بھی معمولی نہیں۔ ایسے پرنویس ہیں کہ روزانہ ایک کتاب لکھ ڈالتے ہیں اور وہ بھی کسی ایک مضمون پر نہیں بلکہ ان کا قلم ہر علم و فن میں رواں ہے۔ پرنویسی اور پر گوئی ایک عیب سمجھا جاتا ہے مگر خواجہ صاحب کے ہاں ہنر ہوگیا ہے۔ ان دو حیثیتوں کے ساتھ انہوں نے دو شاخیں اور بھی قائم کی ہیں۔ ایک حکمت اور دوسری تبلیغ۔ دعا کے ساتھ دوا کا کچھ برا جوڑ نہیں۔ رہی تبلیغ سو وہ بحیثیت مشایخ کے ان کا فرض ہے۔ غرض خواجہ صاحب میں جدت۔ مستعدی۔ پرنویسی۔ زمانہ شناسی کی ایسی صفات موجود ہیں جو شہرت و کامیابی کی ممد و معاون ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا علم گہرا نہیں۔ لیکن معترض یہ نہیں سمجھتے کہ علم کی گہرائی ہمیشہ کارآمد نہیں ہوتی۔ دوسرے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ علم کی گہرائی آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے اس میں جرأت نہیں رہتی اور ایک قسم کا حجاب پیدا کر دیتی ہے۔ اگر خدانخواستہ خواجہ صاحب کا علم بھی ایسا ہی گہرا ہوتا جیسے بعض لوگ قابل تعریف سمجھتے ہیں تو نوبنو مضمونوں۔ اشتہاروں اور کتابوں کی بارش جو ان کے رین بسیرے سے ہوتی ہے کہاں ہوتی اور لوگ اس فیض سے محروم ہی رہ جاتے۔ بعض کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب محقق نہیں۔ معلوم نہیں تحقیق سے ان صاحبوں کا کیا مطلب ہے۔ یہی نہ کہ سالہاسال کسی چیز کی کرید اور چھان بین میں رہے اور ایک عمر کے بعد گوہر مقصود ہاتھ لگا۔ خدا نہ کرے خواجہ صاحب اس ضبط میں مبتلا ہوں۔ یہ سست اور کاہل لوگوں کا کام ہے۔ ان کی ذات اس سے بہت ارفع ہے۔ چشم بد دور ان کی طبیعت میں وہ جدت اور جولانی ہے کہ ہر روز نئی تحقیق فرماتے اور نئی بات نکالتے ہیں۔ یہ تمام اعتراضات خواجہ صاحب کی جدت آفرین طبیعت کے سامنے ہیچ و پوچ ہیں۔ اب ہم ان کتابوں پر جو حال ہی میں خواجہ صاحب نے شایع فرمائی ہیں اور ہمارے پاس بغرض تبصرہ آئی ہیں نظر ڈالتے ہیں —

اسلامی رسول

یہ کتاب اس سلسلہ کی ہے جو خواجہ صاحب نے داعیان اسلام کی تعلیم اور

انسداد ارتداد کے لئے شایع کرنا شروع کیا ھے- یہ کوی ۳۶ صفحے کی کتاب ھے اور اس میں آن حضرت صلعم کے اخلاق و سیرت کو مختصر طور پر بیان کیا ھے-قیمت تھائی آنہ

پنواڑی کی دکان

یہ کتاب بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ھے- بظاھر اس کتاب کا کوئی تعلق اس سلسلے سے نہیں معلوم ھوتا- لیکن یہی وہ بات ھے کہ میں کہتا ھوں کہ خواجہ صاحب کی طبیعت میں خاص جدت ھے- اس کا مقصدیہ ھے کہ بے روزگار مسلمان روزی سے لگ جائیں- روزی سے لگ جانا استحکام ایمان کی دلیل ھے- کیونکہ جو مفلس اور بے روزگار اور مقروض ھے اس کا ایمان ڈانواں ڈول رھتا ھے اور وہ افلاس سے تنگ آکر دوسروں کے ھاتھ میں پھنس جاتا ھے اور دین و ایمان بیچ دیتا ھے- اگرچہ خواجہ صاحب پنواڑی نہیں مگر وہ وہ پتہ کی باتیں لکھی ھیں کہ پنواڑي مسخرا کیا لکھے گا- غرض کوی بات اس دکان کے متعلق نہیں چھوٹی اور ذرا ذراسی باتیں اس تفصیل سے لکھی ھیں کہ خواجہ صاحب کی ذھانت اور مشاھدہ کی داد دینی پڑتی ھے- آخر میں نئي قسم کے اشتھاروں اور خاص کر صداؤں کے جو نمونے دئے ھیں وہ بہت دلچسپ ھیں- بے کار و بے روزگار لوگوں کے پڑھنے کے قابل ھے- اس سے قبل خواجہ صاحب نے مسلمانوں کو صاحب لوگوں کی خانساماں گري کی ھدایت فرمائی تھی اور اس شریف پیشے کے گونا گوں فوائد سے انہیں آگاہ کیا تھا- مگر یہ بدنصیب قوم اپنے سچے ھوا خواھوں کی نصیحت پر بہت کم عمل کرتی ھے- امید ھے کہ اب وہ ایسی غلطی نہ کریں گے اور جس دلسوزي سے خواجہ صاحب نے یہ مشورہ دیا ھے اسی مستعدي سے وہ اس پر عمل کر کے دکھا دیں گے- کتاب دلچسپ اور مفید ھے- قیمت تین آنہ

تاکید نماز

یہ بھی اسی سلسلے کی کتاب ھے- اس میں نماز پڑھنے کی تاکید اور اس کے فوائد بتائے ھیں- خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ آریہ ھمارے بھائیوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے بے دین بنا رھے ھیں- اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی جہالت رفع کرنے کے لئے اس قسم کے رسالے لکھنے شروع کئے ھیں- قیمت تین آنہ

ھندو مذھب کی معلومات

اس کتاب کے ابتدائی چند صفحوں میں ھندو مذھب کے خاص الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح کی ھے- اس کے بعد ھندو مذھب کے مختلف فرقوں کا مختصر حال لکھا ھے- یہ

بالکل ابتدائی کتاب ھے اور جو لوگ ھندو فرقوں اور ان کے مذھب اور ذات سے بالکل نا واقف ھیں ان کے لئے بہت اچھی ھے - ایک بڑی خوبی اس کتاب میں یہ ھے کہ اس کے لکھنے میں خواجہ صاحب نے بہت انصاف اور بے تعصبی سے کام لیا ھے - مجھے اس کا بہت کھٹکا تھا - لیکن کتاب پڑھنے کے بعد رفع ھوگیا - کتاب کے آخر میں نواب سر امین جنگ بہادر (مولوی احمد حسین صاحب) صدر المہام پیشی اعلیحضرت حضور نظام کا ایک مضمون " فلسفۂ ملل ھنود " بطور ضمیمے کے شریک کردیا ھے - یہ مضمون بہت خوب ھے اور اس میں علماے ھنود کی توحید اور حقیقت روح کو بہت صفائی کے ساتھہ بیان کیا ھے - کتاب کے ۶۴ صفحے ھیں اور قیمت آٹھہ آنہ -

داعی اسلام

یہ رسالہ ھر مسلمان کو داعی اسلام بنانے کے لئے لکھا گیا ھے جس میں حفاظت و اشاعت اسلام کی ایسی ایسی حکمتیں اور تدبیریں بتائی ھیں کہ آدمی پڑھکر ششدر رہ جاتا ھے - اس سے جناب خواجہ صاحب کی جودت و جدت طبع - ان کی نظر کی وسعت اور گہرائی - ان کی ھوشیاری اور رسائی فکر معلوم ھوتی ھے - یہ رسالہ عجب انداز سے لکھا ھے - اول ان تمام تقریبوں - رسموں - عام و خاص رواجوں کو نام بنام گنوادیا ھے جن کے اندر قبول اسلام کی ترغیب پائی جاتی ھے یا جن کو دعوت اسلام میں بطور حکمت کے کام میں لایا جاسکتا ھے - اس کے بعد دعوت اسلام کے محکمۂ خبر رسانی اور اس کے فرائض کی تفصیل بیان فرمائی ھے جسے پڑھ کر خواجہ صاحب کی طبع مصلحت بیں اور فکر زمانہ شناس کی داد دینی پڑتی ھے - پھر ھر طبقے اور پیشے کے نام لکھے ھیں اور یہ بتایا ھے کہ ان پیشوں والے دعوت و اشاعت اسلام میں کیا کام کرسکتے ھیں - اس تفصیل میں شاید ھی کوئی طبقہ یا پیشہ چھٹ گیا ھوگا - آخر والیان ریاست کو توجہ دلائی ھے کہ وہ اس میں کیا مدد دے سکتے ھیں -

ملک کی بد نصیبی سے جب شدھی کی تحریک ملک میں جاری ھوئی تو ھندو مسلمانوں میں ایسا نفاق پڑا کہ ذرا ذرا سی بات میں اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دینے لگے - ممکن نہ تھا کہ جناب خواجہ صاحب ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کی کوشش نہ کرتے - یہ کتاب اور اسی قسم کے اور رسالے اور اشتہارات اسی پھوٹ کا پھل ھیں -

غزنوی جہاد

خواجہ صاحب کا ارادہ ھندوستانی مسلمانوں کی جنگی تاریخ لکھنے کا ھے اور یہ اس تاریخ کا پہلا حصہ ھے جسے انہوں نے غزنوی جہاد سے موسوم کیا ھے - اس میں

ان حملوں کا ذکر ہے جو محمود غزنوی نے ہندوستان پر کئے- یہ کتاب نہ تو تاریخی حیثیت سے کوئی خاص وقعت رکھتی ہے اور نہ اس کا طرز بیان ایسا ہے کہ ادبی لحاظ سے قابل وقعت خیال کی جائے- خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ "ہر قوم اپنے بزرگوں کے جنگی حالات سن کر زندہ ہوجاتی ہے- خصوصاً کمزوری اور مایوسی کے دنوں میں جنگی تذکرے ان میں از سر نو جان ڈال دیتے ہیں"- اسی خیال کی بنا پر انہوں نے یہ جنگی سلسلہ شروع کیا ہے "تاکہ مسلمانوں کی عورتیں اور بچے ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کو پڑھ کر اپنے بزرگوں کے جنگی کارناموں کو جان جائیں" لیکن یہ رسالہ بھی اسی بدبختی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں- چنانچہ خود خواجہ صاحب فرماتے ہیں- "میرا خیال ہے کہ آج کل کے زمانہ میں جبکہ آریہ قوم مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے سر توڑ کوشش میں مصروف ہے اور ہزاروں قسم کے جھوٹے الزام اور بہتان مسلمان بادشاہوں پر لگاتی ہے ان رسالوں کا شائع ہونا بہت مفید ہوگا اور مسلمان آریوں کے جھوٹ سے غلط فہمی کا شکار نہونے پائیں گئے اور ان کو اپنے مسلمان حکام اور تاجداروں کے اصلی واقعات معلوم ہوتے رہیں گے"- ہمیں اس میں شبہہ ہے کہ اس قسم کے رسالوں سے یہ مقصد پورا ہوگا- بلکہ اس زمانے میں نفاق کی بھڑکتی ہوئی آگ میں یہ تیل کا کام دیں گے—

خواجہ صاحب نے اس رسالے میں کسی تحقیق سے کام نہیں لیا بلکہ تاریخ فرشتہ سے واقعات نقل کردئے ہیں- سومنات کے وجہ تسمیہ میں مسلمان مورخوں میں اختلاف ہے ان کو خواجہ صاحب نے غلط بتایا ہے اور خود صحیح وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ سوم ایک راجہ کا نام تھا اور نات ایک بڑا بت تھا- جو اس راجہ نے بنوایا تھا- بعدہ کثرت استعمال سے سومنات اس مقام کا نام ہوگیا- ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں "ہندو قوم کا مذہب عناصر پرستی ہے- اس کے جس قدر بت خانے ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی عنصر سے یا سیارہ سے ہوتا ہے- سومنات چاند کا مندر تھا- سوم چاند کو کہتے ہیں"- ہماری رائے میں خواجہ صاحب نے جو یہ دو وجوہ بتائی ہیں وہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں- سوم کے معنے بیشک چاند کے ہیں- مگر نات کے معنے مندر کے نہیں- یہ لفظ ناتھ ہے جس کے معنے آقا کے ہیں- چاند کے آقا شیوجی (مہادیو) ہیں کیونکہ ان کے ماتھے پر چاند ہے- اس لئے یہ مندر شیو جی سے منسوب ہے- قیمت ۸ آنہ—



متفرق

طب

کتاب علم الجراحت

اس کتاب کی تالیف و ترجمه کا کام زبدة الحکما حکیم محمد کبیرالدین صاحب بہاری پروفیسر طبیه کالج دهلی نے انجام دیا هے اور ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب ایل-ایم-ایس مڈیکل آفیسر ریاست بڑوانی نے خاص طور سے ان کی مدد کی هے-سرورق پر کہیں نہیں لکھا که یه کونسی جلد هے-آگے چل کر کسی جگه البته مذکور هے که یه پہلی جلد هے-مضامین کے لحاظ سے البته معلوم هوتا هے که پوری کتاب کے ختم کرنے کے لئے کم از کم ایسی تین یا چار جلدیں اور درکار هوں گی-تعداد طبع اول ۱۰۰۰ اور قیمت پانچ روپیه هے-مطبوعه سنه ۱۹۲۳ع-اوسط تقطیع لکھائی اور کاغذ عمده هے-کل صفحے ۵۰۸ هیں-شروع میں فہرست مضامین هیں مگر آخر میں مضمون نما (Index) نہیں-چند تصاویر بھی هیں جن میں سے بعض کسی قدر مبہم و ناقص هیں-افسوس که شاید خرچ زیادہ هونے کی وجه سے عمده اور رنگین تصاویر کا انتظام نہیں هو سکا-کتاب میں کسی جگه حوالوں کا پته نہیں اور نه یه بتایا گیا هے که کن انگریزی ر مصری کتابوں سے مدد لی گئی هے—

اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر محمد عثمان خاں نے نہایت قابلیت کے ساتھه ۷۲ صفحه کا ایک مقدمه یا تبصرہ لکھا هے جس میں علم طب و فن جراحت کی قدیم تاریخ و موجودہ ترقی پر بحث کی هے—

آخرالذکر پر بہت هی کم لکھا هے-پاسٹیور اور لسٹر کا کہیں ذکر نہیں-قدامت پرستی کی جھلک زیادہ تر نمایاں هے-مثلاً ملاحظه هو صفحه ۲۰ " بقراط کے اعمال جراحیه باستثناے بعض کے اصل میں وهی هیں جو آج زیادہ مہذب و آراسته هو کر مہذب دنیا میں رائج هیں " اگر قابل مبصر کو بروزد ولکم کا مشہور عجائب گھر (آلات جراحیه وغرہ کا) لندن میں دیکھنے کا اتفاق هوتا تو شاید اپنے اس دعوے کو کسی قدر مبالغه آمیز سمجھتے-اسی طرح اس صفحے پر لکھا هے " فخر ایجاد قدیم هنود کا هی حصه هے "-یعنی یونانیوں نے هنود سے اخذ کیا-مصریوں کا کہیں ذکر نہیں حالانکه اب یه پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا هے که مصریوں میں علم طب نہایت قدیم

تھا اور کچھہ عجب نہیں کہ ہنود اور یونانیوں نے بہت سی باتیں انہیں سے اخذ کی ہوں—

آگے چل کر صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں کہ ابن زہر حکیم ابن رشد کا استاد تھا۔ مگر جہاں تک مجھے خیال ہے موسیو رنیان نے اسے اس کا ہم عصر اور دوست بتایا ہے۔ صفحہ ۵۶ پر پرانے حکما کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں " آلۂ عکس کشی تو درکنار شعاع رانت جیننی کے تیز ترین شعاعوں کی عینک چڑھا کر تشخیص ہوئی اور وہ بھی فی صدی نوے حالات میں غلط۔ امتحان قارورہ کے لئے ان کے پاس نہ جدید کیمیاوی تکلفات کا گورک دھندا تھا نہ بے شمار آلات دقیقہ کی زنبیل۔ مگر وہ امراض مثانہ و قلب کی تہ کو ایک ہی غلط انداز نظر میں پہنچ جاتے تھے "—

اس قسم کی یکطرفہ مبالغہ آمیز تحریر مضمون کی وقعت کو نظر سے گرا دیتی ہے اور ایک سائنس داں کے قلم سے حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔اس میں کچھہ شک نہیں کہ بعض قدیم حکیم تشخیص میں ید طولیٰ رکھتے تھے مگر ساتھہ ہی یہ کہنا کہ موجودہ ماہرین فن بشرطیکہ انہیں آلات کا استعمال معلوم ہو نوے فی صدی غلطیاں کرتے ہیں نہ صرف غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ ہٹ دھرمی و تعصب پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اصطلاحات کے متعلق صفحہ ۶۹ پر لکھا ہے "اصطلاحات کے معاملہ میں سخت قواعد و آہنی حدود کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ نہ کوئی ایک مسلمہ دستورالعمل یا واحد مشرب زبان آفرینی کا ٹھیکہ دار ہو سکتا ہے۔ "مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ زبان آفرینی اور اصطلاحات بنانا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اگر "اس میں سخت قواعد و آہنی حدود کی پابندی نہ کی جائیگی" اور ہر مصنف یا مترجم اپنے خیال و رائے کے مطابق اصطلاحیں گھڑ لیا کرے گا اور مطابقت اور یکسانی پیدا نہ ہوگی تو کتب سائنس کا لکھنا ہماری زبان میں نہ صرف مشکل بلکہ پڑھنا اور سمجھنا بھی سخت پریشان کن ہو جائے گا۔ یورپ میں ایک خاص انجمن اس کے لئے مقرر ہے۔ وہ کسی خاص ملک کی نہیں بلکہ بین الاقوام ہے اور بلا اس کی اجازت کے کسی اصطلاح میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک میں بھی ایک ایسی ہی مرکزی انجمن کی سخت ضرورت ہے ورنہ یہ نتیجہ ہوگا کہ بعض کتابیں مولانا حکیم محمد کبیرالدین صاحب کے اصول پر لکھی جائیں گی۔ بعض مولوی وحیدالدین سلیم صاحب اور بعض دوسرے حضرات کی رائے پر جو بجائے آلہ مسماع الصدر۔ یا سینہ بین کے۔ لفظ استتھسکوپ کو ترجیح دیں گے—

کتاب علم الجراحت میں چھہ باب ہیں۔ پہلا علم جراثیم۔ عدویٰ۔ مناعت دوسرا التہاب۔ ورم حار۔ تیسرا عدویٰ صدیدیہ غیر نوعیہ۔ چوتھا تقرح۔ پانچواں غانغرانا چھٹا۔ امراض نوعیہ عفونیہ۔ قابل مولف و مترجم کی زبان دانی میں کوئی کلام نہیں

کہیں ترجمہ کا شبہ نہیں ہوتا۔عبارت سلیس اور مضمون کی شان کے مطابق بلیغ و پر معنی ہے۔اصطلاحات کا مرحلہ طے کر لینے کے بعد کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو پڑھنے سے سمجھ میں نہ آسکے۔یا اس کی عبارت مبہم یا معنی سے قاصر ہو۔یہ واقعی نہایت قابل تعریف ہے۔خصوصاً جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ایک ایسے شخص نے کیا ہے جس کے نام کے شروع میں صرف لفظ حکیم ہے اور ڈاکٹری کی تعلیم اس نے ایسی باضابطہ حاصل نہیں کی کہ کسی ڈگری یا ڈپلوما کا مستحق ہو سکتا —

ہر صفحے کے نیچے لاطینی و انگریزی مرادفات لکھ دئے گئے ہیں۔جن سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔بہتر ہوتا کہ ان کی ایک فرہنگ خط انگریزی میں بھی ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں مندرج کر دی جاتی۔اصطلاحات زیادہ تر علامۂ بہاری (حکیم محمد کبیرالدین صاحب) کے طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔انہیں ”امراض۔آلات و اعضا کے ناموں میں قدما کی کتب سے کافی ذخیرہ ملا ہے مگر جدید معلومات و انکشافات کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑی ہیں جس میں اصول تسمیہ کا امکانی کوشش بھر لحاظ کیا ہے“۔وہ جدید مصری مترادفات کے جو مائی کروبز کو بجائے جراثیم یا اجساد دقیقہ کے میکرو بات کہنا پسند کرتے ہیں۔بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں اور زبان عربی سے پوری طور سے مدد لینا چاہتے ہیں اور ان کے خیال میں ”عربی اور فارسی کا تعلق اس قدر گہرا اور وسیع ہے کہ ہندوستان کا ایک جاہل دہقان بھی اداے مطلب کے لئے سیکڑوں فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرتا ہے“۔اگر یہ اصول ٹھیک ہے اور اہل زبان اور انجمن وضع اصطلاحات نے (بشرطیکہ کوئی ہو) اس پر اتفاق کر لیا۔یعنی اور دیگر طریقوں و اصولوں پر اسے ترجیح دی تو اس میں کچھ شک نہیں کہ علامۂ بہاری کا ہمیں بہت مشکور ہونا چاہئے اور یہ کہنا چاہئے کہ انہوں نے ایک بڑے دشوار گذار مرحلے کو طے کر دیا اور علم طب جدید کے لئے زبان اردو میں ایک آسان راستہ کھولدیا۔قبل اس کے کہ صاحب مذکور کے اس اصول کے موافق یا مخالف کچھ کہا جائے بہتر ہوگا کہ ان کی اصطلاحات کی چند مثالیں پیش کی جائیں —

(۱) تمام اصطلاحات کو زیادہ تر عربی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کیگئی ہے اور بسا اوقات ان کا لفظی ترجمہ کردیا ہے مثلاً جراثیم عقدیہ صدیدیہ (استرپٹو کاکس پیاجے نس Streptococcus pyogenes)۔ہواے شہیق (اکسپائرڈ ایر)۔ورم سحابی (کلاوڈی سولنگ) (۲) بعض لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مترادف الفاظ ہیں ان کی تعداد کم ہے مثلاً ناصور (فسٹولا)۔کباب چینی (کیوبب)۔سیلان رحم (لیوکوریا) (۳) بعض ایسے عام فہم انگریزی الفاظ جو آجکل اردو میں رائج ہوگئے ہیں وہ بھی نکال دئے گئے ہیں اور عربی ترجمہ کو ترجیح دیگئی ہے۔مثلاً مقیاس الحرارت۔تھرمامیٹر کے

لئے- لنجات- پولٹیس کے لئے -قیراط انچ کے لئے اور آب ریه سوڈا واٹر کے لئے (۴) بعض الفاظ خصوصاً ناموں کو معرب بنایا ھے مثلاً لیزول (لائی سال)- سلورزن (سلورسان)- انورسما (انورزم) ــ هشنصوں [هچنسن- جو ایک مشہور ڈاکٹر گذرا ھے]- پیرافیں اور سنٹی میٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی-[۵] بعض الفاظ کے معنی کسی قدر مبہم ھیں اور مفہوم کو پوری طور سے ادا نہیں کرتے -مثلاً مالیکول کے لئے ذرہ اور گلاس سلائڈ کے لئے کانچ کا ٹکڑا- مننجائیٹیس کے لئے سرسام غشائی [جو اصول اختیار کیا گیا ھے اس کے لحاظ سے اسے التہاب غشائی کہنا چاھئے تھا] کیریز کے لئے سڑی ھوئی هڈی- [۶] بعض الفاظ کے لئے فارسی ترکیب کو ترجیح دی گئی ھے- غیر ھوائی [ان ایاروب] قطرہ آویزان [هینگنگ ڈارپ] زخم کے انگور [گرینولیش] شیرہ [اماشن] [۷] کیمیاوی اصطلاحات میں عربی و فارسی دونوں مخلوط ھیں- مجھے معلوم نہیں که دارالترجمه حیدرآباد میں جو الفاظ وضع کئے گئے ھیں ان کی مطابقت کی گئی ھے یا نہیں- ذوریں [فاسفرس] ذورآگین [فاسفیٹ] جست حمض آمیز [زنک آکسائڈ]- لاطینی زبان میں اگر کسی کیمیاوی مرکب کے آخری جزو یا عنصر کے دو مالیکول ھیں تو اس کے نام کے آخر میں آئڈ ide بڑھا دیا جاتا ھے- اگر تین ھیں تو آئٹ ite -اگر چار ھیں تو ایٹ ate اضافه کرتے ھیں- الفاظ آگیں- آمیز و آمیخته جز هم معنی ھیں ان تینوں مطالب کے لئے جدا جدا استعمال کرنے کے لئے کہاں تک موزوں و مناسب ھو سکتے ھیں ؟ یه سوال بہت کچھ تصفیه طلب ھے- مفردات کے لئے " ین " آخر میں زائد کیا گیا ھے- مثلاً فاسفورس [ذورین]- آکسجن [حمضین]- آؤڈین [بنفشیں]- اسپرین [نفسین- مگر دقت یه ھے که اسپرین مرکب ھے]- ۸) متعدد الفاظ کے لئے دو اصطلاحیں ساتھ ساتھ لکھ دی گئی ھیں اور پورا تصفیه نہیں کیا گیا مثلاً گول پٹی [عصابه مدحرجه]- فصلی بخار [حمی متقطعه]- خوردبین [آله مجهر]- جھلیاں [لفائف]- قوت حیوانیه [قابلیت حیات]- پچکاری [محقنه جلدیه] ــ

علامه بہاری کے مختلف طریقوں کو بیان کرنے کے بعد اب ضروری ھے کے اس اصول سے بحث کی جائے جس پر ان کا عمل درآمد رھا ھے- وہ انگریزی و لاطینی اصطلاحات کو زبان اردو سے دور کر کے ترجمه یا مترادف عربی الفاظ کو ترجیح دیتے ھیں اور اس کے موافق جو وجوہ پیش کرتے ھیں وہ یه ھیں ــ

۱ــ لاطینی الفاظ سے ھمارے کان " بالکل ناآشنا ھیں "ــ

۲ــ لاطینی اصطلاحات " ھماری زبان کی ترقی کے لئے مفید نہیں ھو سکیں "ــ

۳ــ عربی و فارسی سے تمام مترادفات و اصطلاحات وضع کئے جا سکتے ھیں ــ

ان تینوں باتوں کے کسی حد تک صحیح ھونے میں کلام نہیں- مگر اب فریق ثانی کے اعتراضات کو بھی دیکھنا چاھئے اور اس کی بعض مشکلات کو حل کرنے کی کوشش

کرنا چاهئے-وہ یہ هیں:—

(۱) عربی میں لاطینی کے طرح اصطلاحات بنانے میں ایسی آسانی نہیں-لاطینی لفظ کے شروع یا آخر میں چھوٹی چھوٹی علامات لگا دینے سے بہت سے نئے الفاظ بن سکتے هیں مثلاً آئی تیز کے زائد کر دینے سے التهاب کے معنی پیدا هو جاتے هیں منِنجیز (Meninges) سے مننجائیٹز Meningetes هو گیا-عربی میں ایک پورا لفظ زائد کرکے اسی کو التهاب غشائی کہنا پڑے گا—

(۲) اردو زبان مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے-وہ عربی اور فارسی نہیں ہے جو صرف ایک ملک و قوم کے لئے محدود هو-اسے هم کل هندوستان کے لئے موزوں بنانا چاهتے هیں جس میں مختلف اقوام اور مختلف زبانوں کے لوگ بستے هیں-اس میں شک نہیں کہ عربی و فارسی کے اس میں بہت سے الفاظ هیں مگر ساتھ هی سنسکرت اور هندی کے الفاظ بھی کچھ کم نہیں اور انگریزی الفاظ بھی اب بکثرت رواج پاتے جاتے هیں-یہ کہنا کہ "هندوستان کا ایک جاهل دهقان بھی ادائے مطلب کے لئے سیکڑوں فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرتا ہے" مبالغہ آمیز ہے-سوائے ممالک متحدہ کے فارسی و عربی تو کجا سادی هندی اردو سے بھی اکثر دهقانوں کے کان ناآشنا پائے جائیں گے-عثمانیہ میڈیکل کالج کا [جس کے نصاب کو اردو میں کرنے کا ارادہ ہے] ایک طالب علم [زیادہ تعداد هندؤں کی ہے] جس کی زبان شاید مرهٹی ہے "حونیہ متشکلہ" کو زیادہ مشکل و ناآشنا سمجھے گا یا "ایمی با" کو-اگر یہ اصطلاحات طبیہ کالج دهلی کے جماعت سال سوئم و چہارم کے لئے مخصوص هیں تو کسی کو اعتراض نہیں هو سکتا-مگر همارا منشا یہ نہ هونا چاهئیے کہ علمی کتابوں کو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص کردیں بلکہ یہ نصب العین سامنے رهنا چاهئیے کہ کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون هماری هی زبان میں هندوستان کے هر صوبہ میں پڑھائے جائیں گے اور ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں کیا طریقے هو سکتے هیں؟

(۳) ڈاکٹری یا مغربی علم طب کی حالت همارے ملک میں دیگر شعبہائے سائنس سے بالکل مختلف ہے-یعنی کیمسٹری و طبیعات کے جاننے والے بہت کم هیں مگر انگریزی دواؤں وغیرہ کا چرچا هر گھر میں زیادہ هوتا جا رہا ہے-بکثرت ادویات کے ناموں سے معمولی لوگوں کے کان آشنا هوگئے هیں-دواخانے بھی انگریزی زبان کے نسخوں کے عادی هیں-اگر عربی مترادفات میں نسخے لکھے گئے تو یا تو ان کی سمجھ میں آنا ناممکن ہے یا ان کو ایک علیحدہ فہرست اس کی اپنے پاس رکھنی پڑے گی اور قدم قدم پر غلطیاں کریں گے—

(۴) عموماً ڈاکٹری کے طالب علم انگریزی داں هوتے هیں-اگر اردو هی میں تمام نصاب کر دیا جائے تو بھی اس زبان کی تعلیم بند نہیں کی جاسکتی-ظاهر ہے کہ

یہ طالب علم دوسری کتابوں سے بھی مدد لینا چاہیں گے جو صرف انگریزی ہی میں موجود ہوں گی اور بعض اپنے افادہ و ترقی علم کے لئے طبی رسائل و اخبارات کو بھی غیر زبان میں پڑھنا چاہیں گے-جس کے یہ معنی ہوئے کہ لاطینی اصطلاحیں لامحالہ انہیں معلوم ہونا چاہئیں اور اس طرح دہری محنت انہیں کرنی پڑے گی جو بالکل غیر ضروری ہے غرضکہ ان تمام باتوں کو واضعین اصطلاحات طبی اور خصوصاً اس انجمن کو جسے بہت جلد اس کام کو اپنے ذمہ لینا چاہئے مدنظر رکھنا چاہئے-ممکن ہے کہ وہ لاطینی الفاظ کے ذخار سمندر کو دیکھکر گھبرا جائیں اور فطرتی جذبات قومی بھی غالب آکر غیر جنس زبان سے مدد لینے پر آمادہ نہ کریں- ایسی حالت میں اگر مصریوں کے طرح ایک درمیانی راہ اختیار کی جائے تو کیا ہرج ہے ؟ بعض بعض آسان عربی اصطلاحات کو بھی قائم رکھا جائے-بجاے بکٹیریا کے جراثیم کہا جائے-مگر ٹائفائڈ بخار کو بجاے حمی مطبقہ متناقصہ کے ٹیفوئڈ کے نام سے یاد کیا جائے-مقیاس الحرارت کو تھرما میٹر رکھا جاے-پروٹوزواکو بجاے حونیات کے بروتوزوا-پولٹس کو پلٹس-اسٹتھسکوپ کو سینہ بین-چنانچہ اس طرح فریقین کو شاید کوئی شکایت کا موقعہ نہ ملے اور ان کے سمجھنے میں بھی دقت نہ ہو جیسا اوپر مذکور ہوچکا ہے گو ہر شخص کو اپنی راے دینے کا اختیار ہے مگر اصطلاحات کے موضوع کا تمامتر فیصلہ کثرت راے پر ہونا چاہئے اور اس کا کام ایسی انجمن کے سپرد کرنا چاہئے جس کے افراد کی قابلیت پر سب کو اعتماد کلی ہو اور ان کی پوری طرح سے پیروی کی جائے-الغرض یہ نہایت اہم مسئلہ ابھی تک فیصلہ کا محتاج ہے-مگر کتاب زیر ریویو کی خوبیوں میں اس سے ہرگز کوئی کمی نہیں عائد ہوسکتی-میرے خیال میں اردو زبان میں ابتک اس سے بہتر ترجمہ کسی سرجری کے کتاب کا نہیں کیا گیا اور امید ہے کہ لائق مصنف باقی جلدوں کو بھی تالیف کرکے مدرسۂ طبیہ کے نصاب میں ایک نہایت گران بہا اور قابل قدر اضافہ فرمائیں گے—

(نوٹ:— مکرم اڈیٹر رسالۂ ”اردو“ سے گزارش ہے کہ میں نے سنا ہے ڈاکٹری کتابوں کا ترجمہ عنقریب حیدرآباد میں شروع ہونے والا ہے-مگر جہاں تک مجھے خیال ہے اصطلاحات کا تصفیہ کرنے کے لئے کوئی خاص انجمن یا مرکزی جماعت ابھی تک مقرر نہیں کی گئی-اس کی سخت ضرورت ہے-اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو آپ مہربانی فرماکر ہندوستان کے مختلف ماہرین کو خطوط لکھکر ان کی راے دریافت کرسکتے ہیں اور رسالۂ اردو میں ایک نہایت عمدہ ومفید بحث اس مضمون پر ہوسکتی ہے کہ آیا عربی اصطلاحات قائم کئے جائیں یا لاطینی یا ان کی مرادفات)

مرقومہ ل-ح-خ (ڈاکٹر)

هیئت جدید

مولفین نے جیسا دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے ہیئت جدید زیادہ تر پروفیسر ینگ کی بڑی کتاب جنرل استرونومی کی بنا پر تالیف کی گئی ہے مگر کتاب کا حیطۂ اقتباس یہیں تک محدود نہیں رکھا گیا۔قدیم اور جدید ہیئت کے مسائل ہیئت کی تمام مستند کتابوں اور رسالوں سے اخذ کر کے بے حد سادگی اور سلاست سے پیش کئے گئے ہیں۔علم ہیئت کی اصولی تفہیم بغیر اعلی ریاضی کے دقیق مسائل کے نہیں ہو سکتی۔ان کو جگہ نہیں دی گئی۔مگر ابتدائی ریاضی کی مدد سے جہاں تک افلاک کی ترتیب و نظم کے اساسی اصولوں پر روشنی ڈالی جا سکتی تھی کتاب کے متن میں ایسے کلیات ریاضی سے جا بجا امداد لی گئی ہے۔کتاب کی طبیعی اور "بیانی" حیثیت مکمل ہے —

ہیئت جدید بہت ضخیم کتاب ہے ۸۰۹ صفحات۔تین حصوں اور سات مقالوں پر مشتمل ہے۔مقالہ اول کی تالیفات میں مزید تفصیل کی گنجائش ہے۔کرۂ فلکی کے خطوط حوالہ کا زمین کے متناظر خطوط کے ساتھ ملتبس ہونے کا احتمال ہے۔زمین کے مقام کو فضا میں قائم کر کے اس کے خطوط کا تطابق کرۂ سماوی کے خطوط کے ساتھ پہلے صحت سے پیدا کرنا زیادہ مناسب تھا۔ہیئت کی کم کتابوں میں تواریخ عالم کے تفصیلی حالات مندرج ہوتے ہیں۔باب ششم حصۂ اول خوبی مضمون اور معلومات کے لحاظ سے یگانہ ہے۔دوسرا مقالہ تجاذب مادہ اور اس کے مظہرات پر ہے یہ زیادہ تر ریاضی ہے اس کی ترتیب و ترجیہ ہیئت کی عام کتابوں سے مختلف اور قابل ترجیح ہے۔عملی ہیئت مزید توجہ کی مستحق تھی۔تجزیۂ نور جس کے ساتھ علم ہیئت کی آئندہ تحقیق ایک مدت تک وابستہ ہے اس کتاب کے مکمل اوراق میں سے ہے۔گرہنوں کا بیان پرانے توہمات کی پوری تردید ہے۔سیروس کی تشریح بالتفصیل کی گئی ہے۔مناظر کسوف و خسوف واقعات کی دہشت خیز عبارت میں مرقوم ہیں

حصہ دوم و سوم بالترتیب نظام شمسی اور ثوابت سے متعلق ہیں۔پوری وسعت سے سیارات سفلی و علوی کا بیان یکے بعد دیگرے ترتیب وار منضبط ہے۔کسی جرم کی کسی کیفیت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو مولفین کی نظر سے حجاب میں رہا ہو ایسا مبسوط بیان ایک جگہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ثوابت کے مجمعے اور جھرمٹ۔ان کی شناخت آسمان میں۔ان کے مختصر حالات۔ان کا تغیر۔ان کی حرکات اجمالی طور پر پوری صحت سے مندرج ہیں۔آخر میں ارتقاے عالم۔نظریۂ سحابیہ۔آغاز و انجام عالم کے متعلق حکماء محققین پر ہیئت کے قیاسات پیش کئے گئے ہیں۔

نظریہ آئین ستائین کا سرسری ذکر عطارد کی بے قاعدہ حرکت کی ضمن میں آیا ہے۔ مگر اس نظریہ کی پوری حقیقت اور علم ہیئت کے رگ و ریشہ میں اس کے اطلاق کی ترقیم ابھی باقی ہے—

سائنس اور ریاضی داں دو واجب التعظیم افراد کے متحدہ افکار اور کوششوں کا بہترین نتیجہ "ہیئت جدید" اردو زبان میں علم ہیئت پر پہلی مستند کتاب ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے۔عبارت اہل سائنس کے قلم کی معلوم ہوتی ہے۔امور ایک دوسرے سے مترشح ہوتے ہیں۔ان کا باہمی تعلق عیاں ہے لیکن سطح سے زیادہ نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی گئی۔تمام اقسام کے مطالب فراہم کر کے ان کو کھلے دل سے کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔عام ناظر کے لئے یہ افسانۂ افلاک مکمل۔دلچسپ۔خوش کن واقعات عالم کا صحیفہ ہے مگر گہرے غوطہ زن طالب علم کا تجسس پورا نہیں ہوتا۔ فرہنگ مصطلحات مکمل ہے۔اس کے دیکھنے سے قدرے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدیم اصطلاحات کو کھود کر نکالنے۔ان کی تصدیق کرنے اور نئی اصطلاحات کے وضع کرنے میں کس قدر جدت۔محنت اور استقلال سے کام لیا گیا ہے مگر مصطلحات میں تکلف ہے تسہیل علم میں پرانی قیود سے ایک حد تک آزادی برتنا زیادہ مناسب تھا—

ہیئت جدید تحفۂ افلاک ہے۔دنیا کے تنگ فاصلوں کو چھوڑ کر وسعت مافی السموات کا تخیل انسانی محدود دلوں میں پیدا کرتی ہے۔اس کی اشاعت علم اور علم دوست دنیا کی سچی خدمت ہے۔یہ کتاب ہر طرح سے مقبولیت کی مستحق ہے اور امید ہے کہ مقبول ہو گی—

سیاسیات

آج کل اردو زبان میں اکثر علمی کتابیں ترجمہ یا تصنیف ہو رہی ہیں لیکن سیاسیات پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔اب یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ محمد اجمل خاں صاحب بی۔اے (علیگ) نے اس نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں اصول سیاسیات پر علمی بحث کی ہے۔جیسا کہ خود مصنف صاحب دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں اس کتاب کا مقصد یہ ہے "کہ ماہرین سیاسیات کے خیالات کو باقاعدہ مسلسل اور علمی طریقہ سے جمع کیا جائے" اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کو یہ کتاب بہت اچھی طرح پورا کرتی ہے —

کتاب میں آٹھ باب ہیں اور ہر باب چند مقالات پر مشتمل ہے۔یہ ترتیب کسی قدر پیچیدہ ہے۔اس سے کتاب میں "لکچر نوٹس" کی شان ضرور پیدا ہو گئی ہے۔بے شمار عنوانات ہیں اور ہر عنوان پر چند سطروں میں بحث کی گئی ہے۔لیکن مستقل علمی بحث کے لئے جس تفصیل اور وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ کہیں نہیں پائی جاتی مثلاً

صفحه ۲۷۲ پر ایک نیا مقاله "سلطنت بحیثیت نظام الہی" شروع ہوا ہے- یہ مقاله صفحه ۲۷۵ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن ان صفحات میں جو کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں انہیں آٹھ چھوٹے چھوٹے عنوانات پر تقسیم کر دیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں (۱) خدا کی براہ راست حکومت (۲) خدا کی بالواسطه حکومت (۳) بادشاہی حکومت (۴) بادشاہ مثل خدائی نمایندے کے (۵) الہی احکام (۶) غیر ذمه داری (۷) جبر و قدر (۸) دونوں کی کمزوری-ذہن پوری طور پر ایک عنوان کو سمجھنے بھی نہیں پاتا کہ ایک دوسرا عنوان سامنے آجاتا ہے اور بحث تشنه رہ جاتی ہے—

مختصر یہ که اس کتاب میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ یہ ہی ہے کہ یہ بہت سرسری ہے-طلبا اور متعلمین سیاسیات کے لئے بہت مفید ہے لیکن جو سیاسیات کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نه ہو اس کی تشفی نہیں کر سکتی-اس کی مثال "اشتراکی حکومت" کی بحث ہے-بالشویکی فرقه کے نام سے ہمارے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے اور اس فرقه کے اصول حکومت کے متعلق عجیب و غریب روایات عوام میں مشہور ہیں لیکن قابل مصنف نے صرف تین صفحے "انقلاب روس" کے عنوان سے لکھے ہیں اور ان میں چھ چھ سات سات سطروں میں "ذاتی ملکیت" اور "اثرات اشتراک" سے بحث کر دی ہے جو یقیناً بہت کچھ تشنه ہے—

بعض اصطلاحات کے ترجمے بھی محتاج توجه ہیں-افسوس ہے که جب مصنفین اردو کوئی کتاب ترجمه کرنے بیٹھتے ہیں تو تحقیق و کوشش سے یہ دریافت نہیں کرتے که آیا اس خاص علم کی اصطلاحات کا ترجمه پہلے ہو چکا ہے یا نہیں-بلکه خود ترجمه کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجه یہ ہوتا ہے که ایک ہی علم کی اصطلاحات کے مختلف ترجمے ملک میں پھیلتے ہیں اور بہت کچھ الجھن پیدا کرتے ہیں-جامعه عثمانیه نے سیاسیات کے متعلق بہت سی اصطلاحات کا ترجمه کر لیا ہے-اسے ملک میں پھیلانے کی کوشش ہونی چاہئے-مثلاً Sociology کا ترجمه بجائے اجتماعیات کے "عمرانیات" ہونا چاہئے-Mythology کا ترجمه اساطیر جاهلیه کیا گیا ہے حالانکه اس کے لئے صنمیات یا پھر "دیو مالا" کا لفظ بہت اچھا موجود ہے-اسی طرح سے Institutions کا ترجمه تنسیقات کیا گیا ہے حالانکه "ادارات" زیادہ مناسب ہے- "Patriarchal" کا مفہوم "خاندانی" کے لفظ سے کسی طرح پورا نہیں ہوتا- "پدری" بہت مناسب ہے کیونکه اس کے مقابل Matriarchal (مادری) موجود ہے- اسی طرح سے Oligarchy کا صحیح مفہوم "چند سری حکومت" سے جتنی اچھی طرح واضح ہوتا ہے حکومةالخواص سے نہیں ہوتا—

کتاب مجلد ہے لکھائی چھپائی کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں- "ناظم قومی دارالاشاعت-سرائے گڈھا-الہ آباد" سے دو روپیه میں مل سکتی ہے—

جدید رسالے

—:0:—

گرو سیوک

یہ ماہوار رسالہ " زیر مصلحت مرشدی و مولای حضرت خواجہ حسن نظامی" دہلی سے شائع ہوا ہے۔" مالک و ناشر ملنسار نظامی۔ اڈیٹر بقای نقشبندی دہلوی"۔ " زیر مصلحت " کا لفظ بہت وسیع معنے رکھتا ہے اور خواجہ صاحب کے لئے بہت موزوں ہے۔ رسالے کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسرے نمبر میں پہلا مضمون حضرت خواجہ صاحب کا " گرو بھگتی " پڑھے۔ جس میں ارشاد ہوا ہے " خدا اگر ناراض ہو جاے تو ٹھکانا مل سکتا ہے۔ مگر گرو خفا ہوجائے تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں۔ کیونکہ اگر گرو راضی ہے تو وہ خدا کی ناراضی سے چیلہ کو اپدیش دیکر بچا لے گا اور اگر گرو ناراض ہوگیا تو پھر چیلے کا کہیں بھی ٹھکانا نہیں "۔ دوسرا مضمون " پرم پتا سے فریاد " اور تیسرا " چشتی گرو کی تعلیم " بھی حضرت خواجہ صاحب ہی کے قلم سے نکلے ہیں۔ چوتھا مضمون " جھینگر کی آواز " بھی خواجہ صاحب کا ہے جس میں ان کی انشاپردازی کی خاص شان نظر آتی ہے۔ آخر میں ایک مضون " تن من بیتی " ہے جو خواجہ صاحب کا روزنامچہ ہے اور بہت پر لطف ہے۔ سر ورق بہت خوبصورت ہے۔ چھپائی لکھائی بہت اچھی۔ سالانہ قیمت تین روپے —

المعلم

یہ ماہانہ رسالہ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا ہے۔ اس کا موضوع تعلیم ہے۔ حیدرآباد میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ باقاعدہ جاری ہونے لگا ہے اور بڑی کمی کو پورا کر رہا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے نام میں " ال " کی کیا ضرورت تھی۔ معلم بالکل کافی تھا —

پہلے نمبر میں تین مضمون ہیں۔ تصورات و تخیلات اطفال۔ پیمایش ذہن اور مصلحان تعلیم۔ اس کے بعد رپورٹ ترقی تعلیم ممالک محروسہ سرکارعالی پر تبصرہ اور چند شذرات ہیں۔ پیمائش ذہن مولوی سید وہاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج کا مضمون ہے۔ اردو زبان میں غالباً اس سے قبل اس مسئلہ پر بحث نہیں ہوئی۔

دوسرے نمبر میں پیمائش ذہن اور مصلحان تعلیم کے مضمون جاری ہیں۔ ان کے علاوہ تدریس میں تکان اور بڑودہ کے کتب خانہ کے مضامین ہیں۔ آخر میں قابل اڈیٹر مولوی سید محمد حسین صاحب صدر مہتمم تعلیمات حال نائب ناظم تعلیمات نے

" مضمون نگاری اور ترجمه اردو امتحان مڈل " پر بہت اچھی تحریر شایع کی هے اور طلبه جو زبان اور مضمون نویسی میں عام طور پر غلطیاں کرتے هیں انہیں مثالیں دیکر ظاهر کیا هے اور اس کے متعلق مفید هدایتیں دی هیں جو طلبه اور اساتذہ دونوں کے لئے کارآمد هوں گی - لیکن هماری درخواست هے که خود جناب اڈیٹر صاحب اور ان کے لائق مضمون نگار بھی اس کا خیال رکھیں گے - پہلے نمبر میں جو " بیان حال " اڈیٹر صاحب نے تحریر فرمایا هے اس میں ایسی هی غلطیاں پائی جاتی هیں جو طالب علم اپنے مضامین میں کرتے هیں - نمونے کے طور پر چند یہاں لکھی جاتی هیں —

(۱) یورپ میں مختلف اقوام میں ایسے نیک وجود گزرے هیں جو ... ملک و قوم کی تعلیمی حالت کی ترویج و ترقی پر اپنے قلم دماغ اور مال و دولت بلکه اپنی هستیوں کو قربان کردیا —

(۲) " بعض اضلاع میں کانفرنس اساتذہ منعقد هوئیں " —

(۳) " نارمل اسکولس سے جو مدرسین ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد دیہی مدارس روانہ کئے جاتے هیں " —

(۴) " وقتاً فوقتاً " - یه فقرہ بار بار اسی طرح استعمال کیا گیا هے —

(۵) " اب یه جادو جس سے بچے اکنات و اطراف کے حالات و اشیاء میں تقلب و تحویل کرتے هیں رفته رفته سن کے ساتھ ٹوٹتا جاتا هے " - محاورہ طلسم ٹوٹنا هے جادو ٹوٹنا نہیں هے —

(۶) " کہانی کے واقعات کو بچے سرگشت سمجھنے لگتے هیں " - سرگشت کا لفظ سمجھ میں نہیں آیا —

(۷) کیڑے کو خود کھا لینا اس لڑکی سے اس لئے واقع هوا که اس لڑکی میں مادہ تخیل و تصور اس درجه پر تھا که وہ اپنے آپ کو چڑیا تصور کر کے کیڑا کھالی —

رسالے کے مقاصد کے ضمن میں یه بھی بیان کیا گیا هے که اس رسالے کا معیار ملک کے مدرسین مدارس تحتانیه کی لیاقت اور استعداد کے لحاظ سے رهیگا - لیکن ذیل کے جملے جو خود قابل اڈیٹر صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمائے هیں تحتانیه مدارس کی لیاقت اور استعداد سے بالا هیں —

(۱) " دیرینه تمنائیں اور مخفی آرزوئیں ممکن عدم سے منصۂ ظہور میں آئیں اور به حیثیت ایک انسان ظلوم و جہول کے هم نے اس امانت کے بارگراں کو اپنے سر پر اٹھا لیا هے —

(۲) یه طلسمی مادہ تحویل و تقلب اشیا کا سب بچوں میں یکساں نہیں هوتا - بعض جملوں کا طرز بیان پیچیدہ هے اور بیان میں گنجھلک هے - مثلاً " وهی وہ مضمون

ھیں کہ جن کی تعلیم میں بچوں کو آزادی سے حواس خمسہ کو کام میں لاکر ذاتی تحقیق اور تجسس کی ذریعہ کے کسی نتیجہ کو پہونچنے کا موقع حاصل ھوسکتا ھے " -(بیان حال)

رسالہ کسی قدر مردہ معلوم ھوتا ھے-اس کے مضامین میں کسی قسم کی شگفتگی نہیں پائی جاتی-اس میں ایسے مضامیں ضرور ھونے چاھئیں جنھیں طلبہ اور مدرسیں شوق سے پڑھیں اور ان میں صحیح ذوق پیدا ھو اور مروجہ طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کی ترغیب ھو—

یہ بھی بڑی خوشی کی بات ھے کہ رسالہ ریاست کے دیسی کاغذ پر چھپتا ھے اور لکھائی چھپائی اچھی ھے—

اس میں شبہ نہیں کہ ایسے رسالہ کی یہاں بیحد ضرورت تھی اور اگر مضامیں کے انتخاب اور تحریر میں محنت اور ذوق سلیم سے کام لیا گیا تو یہ بہت مفید ثابت ھوگا-

تعداد صفحات ۳۲-قیمت سالانہ ۳ روپیہ ۸ آنے—

سوز و ساز

اس نام کا رسالہ دھلی سے ھر مہینے " بظل حمایت مصور فطرت حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی " شایع ھوتا ھے-اڈیٹر ملک الکلام قوی امروھوی ھیں-اس رسالے میں کیا ھوتا ھے ؟ یہ سرورق سے ظاھر ھے-جہاں سب سے اوپر یہ لکھا ھے " اردو زبان کا شاندار علمی-ادبی-تاریخی-مذھبی-اخلاقی-تمدنی-معاشرتی-طبی تفریحی-اصلاحی-ملکی اور سیاسی کا ماھوار مجموعہ " اس کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رھتی اور حقیقت میں سبھی کچھہ ھوتا ھے-جناب خواجہ صاحب کا ظل حمایت کافی ھے-خواجہ صاحب خود بھی کبھی اس میں کچھہ تحریر فرماتے ھیں-چنانچہ " پڑوس کے سترہ پاجی " حضرت ھی کا لکھا ھوا ھے-عنوان خود کاتب کی چغلی کھا رھا ھے-مضمون دلچسپ ھے اور خواجہ صاحب نے اپنے خاص طرز میں لکھا ھے یہ پاجی کھٹمل-جوئیں-مچھر-پسو-چوھے-مکڑیاں وغیرہ ھیں-رسالہ مختلف قسم کے مضامین کا اچھا مجموعہ ھے اور سفر و حضر میں دلچسپی کا مشغلہ ھوسکتا ھے-بڑی تقطیع-باریک خط-چھپائی-لکھائی اور کاغذ بہت اچھا-۲۴ صفحے-سالانہ چندہ ساڑھے چار روپیہ—

تحفہ

انجمن ارباب اردو (حیدرآباد دکن) کا ماھوار علمی رسالہ ھے-جس میں

مختلف قسم کے علمی مضامین درج هیں اور بلحاظ معلومات قابل قدر کوشش هے۔ اس رسالے کے دیکھنے سے معلوم هوتا هے که اهل حیدرآباد میں علمی ذوق پیدا هوتا جاتا هے اور یه امر بہت قابل مسرت هے۔ رساله بڑی تقطیع پر پچاس صفحے کا هوتا هے سالانه چندہ پانچ روپیه هے—

تاج

یه ماهوار رساله بهی حیدرآباد دکن سے شایع هوا هے۔اس میں علمی اور تاریخی مضامین اچھے اچھے لکھے گئے هیں۔نظم کا بهی کافی حصه هے۔ حیدرآباد کے یه دونوں رسالے یعنے تحفه اور تاج بلا شبهه قابل قدر هیں۔میانه تقطیع پر ۶۸ صفحے هوتے هیں۔سالانه چندہ چار روپیه آٹھ آنے هے—

نیرنگ خیال

یه ماهوار رساله لاهور سے شایع هوا هے جواردو اخباروں اور رسالوں کا مخزن هے۔اڈیٹروں نے رسالے کے دلچسپ بنانے میں بہت کوشش کی هے۔شروع میں ایک عمدہ تصویر بهی هوتی هے۔اگرچه اس رسالے میں علمی مضامیں بهی هوتے هیں لیکن زیادہ تر ایسے مضامین نظر آتے هیں جن کا تعلق تخیل سے هے۔نظمیں بهی هر قسم کی هیں۔بڑی تقطیع۔تعداد صفحات ۵۰۔سالانه چندہ تین روپئے۔اس قیمت میں رساله بہت اچھا هے۔

ستارہ

یه رساله بهی حال هی میں علیگڈہ سے شایع هونا شروع هوا هے۔ادبی اور علمی مضامین هوتے هیں۔نظم کا بهی حصه هے۔رساله دلچسپ اور پڑھنے کے قابل هے۔ تین جز پر مربع نما شایع هوتا هے۔سالانه چندہ تین روپیه آٹھ آنے هے۔اڈیٹر مینا زبیری مارهروی (علیگ) هیں—



تازہ ترین مطبوعات انجمن

جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ملک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا-نواب صاحب موصوف نے وهاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا-کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ھے-جو همارے اهل وطن کے لئے بہت سبق آموز ھے-اردو میں یہ پہلی کتاب ھے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ھے-هر محب وطن کا فرض ھے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ھونے کے پر از معلومات ھے-خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ھے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ھیں (حجم ۴۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات

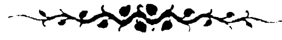
یا

آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت هی سلیس زبان میں بیان کی گئی ھے-حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ھے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ھے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا هوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ھے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا-یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ھے اور هر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ھے (حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار

مطبوعات انجمن



تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دهلوی۔ میرحسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی بدرِمنیر کو جو قبول عام نصیب هوا شاید هی اردو کی کسی کتاب کو نصیب هوا هو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف هے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تهی بڑی کوشش سے بہم پهونچا کر طبع کی گئی هے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت هے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا هے جو قابل پڑهنے کے هے قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار غیر مجلد ایک روپیہ ۶ آنہ کلدار—

تاریخ تمدن

سر تامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ هے۔ الف سے ی تک تمدن کے هر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی هے اور هر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا هے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذهن میں وسعت پیدا هوتی هے۔ حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار—

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ هے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم هکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت هے۔ اس میں بظاهر فطرت کی بحث درج هے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع هے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار—

القول الاظهر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف فوزالاصغر کا یہ اردو ترجمہ هے یہ کتاب فلسفۂ الٰہیین کے اصول پر لکھی گئی هے اور مذهب اسلام پر انهیں اصول کو منطبق کیا گیا هے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار—

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات هوے هیں اُن سب کو جمع کر دیا هے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت هے قیمت غیر مجلد ۱۰ آنہ کلدار—

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوص کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا هے جن اصول

اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے قاعدہ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار کلید قاعدہ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۳ روپیہ کلدار غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار - مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے - تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاہیر یونان و روما

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی عزم - جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار - مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۲ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے - اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے - حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر - تحقیق صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن - معاشرت - اصول اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست وشگفتگی کا نمونہ-اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے-ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے-مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے- قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے-علمی اصطلاحات سے معرا-سلاست و روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے-طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا پانی غذا لباس مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے-زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے-ملک کی بہترین تصنیف ہے-اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا-حجم ایک ہزار صفحے-قیمت مجلد چار روپیہ—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے-بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت بغیر جلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے-اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طورپر معروف نہیں-نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں-مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرلصدور امور مذہبی سرکارعالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے-قیمت مجلد دوروپیہ ۴ آنہ کلدار

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے-"جذبات" کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے-متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے-قیمت مجلد دوروپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دوروپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہاسال کے غور و فکر

اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"- اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے - سابقوں اور لاحقوں - اردو مصادر اور ان کے مشتقات - غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کردئے ہیں - اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے - خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے - علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے - یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالارا مضمون ہے - اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا - صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا - اس میں میرزا غالب کا قدیم وجدید تمام کلام موجود ہے - مہر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی - یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھہ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن مجلد پانچ روپیہ کلدار - غیر مجلد چار روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد تین روپیہ ۸ انہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اس مین بعض قدیم اقوام - سلطنت کلدانی - آشوری - بابل - بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقائد صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی -

جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں-صفحہ ۲۷۴-قیمت مجلد دو روپیہ ۶ آنہ کلدار

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی-اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے-کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے-یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے-قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار

———:o:———



حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)



(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱-سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲-سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳-شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۴-سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۵-علم الکلام ۲ روپیہ
۶-الکلام ۲ روپیہ
۷-کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸-اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۹-انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۰-برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱-مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲-مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۳-تفسیر ابو مسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۴-سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۵-روح الاجتماع ۲ روپیہ

(مطبع کاویانی-برلن)

۱-سفرنامہ حکیم ناصر خسرو (فارسی) ۶ روپیہ ۸ آنہ
۲-زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳-گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴-تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵-تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶-نصاب الصبیاں (فارسی) ۱ روپیہ
۷-رہنمائے پسراں (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸-تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ

———:o:———

(جامعہ ملیہ-علی گڈھ)

۱-الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲-الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳-بصائر ۶ آنہ

۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۹- انتخاب میر (از نور الرحمن صاحب)
۱ روپیہ
۱۰- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۱- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۲- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۳- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۴- ازہار العرب ۸ آنہ
۱۵- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۶- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۷- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
۱۸- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب ۲ آنہ

———:o:———

(نظامی پریس - بدایون)

۱- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۲- دیوان غالب مشرح مجلد ڈھائی روپیہ
۳- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
۸ آنہ
۴- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۵- دیوان غالب لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۷- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۸- لتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۹- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۰- مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیہ

۱۱- مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم دوم
۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- بدمزاج شوہر ۱ آنہ
۱۶- راکھہ بیگم ۱ آنہ

———:o:———

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

۱- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۲- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۳- مینائے سخن ۱ روپیہ
۴- حزن اختر ۸ آنہ
۵- درس عمل ۴ آنہ
۶- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۷- بیگمات بنگال ۶ آنہ
۸- اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنہ
۹- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
۱۰- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۱- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

———:o:———

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- الفاروق ۳ روپیہ
۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۸ آنہ
۳- اسلامی مدارس ۴ آنہ
۴- اسلامی حکومت ۲ آنہ
۵- زیب النسا ۲ آنہ
۶- جہانگیر ۲ آنہ
۷- نظم شبلی ۴ آنہ

۸- نفس اللغة	۱ روپیہ
۹- ترانۂ شوق	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- خوبیٔ سخن	۸ آنہ
۱۱- دیگر مسالک میں قطع تعلق	۱۰ آنہ
۱۲- صبح امید	۴ آنہ
۱۳- آزادی اسلام	۴ آنہ
۱۴- مصطفیٰ کمال پاشا	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- گوکھلے کی تقریریں	۱۲ آنہ
۱۶- سلف گورنمنٹ	۶ آنہ
۱۷- عالم خیال	۸ آنہ
۱۸- شکوۂ اقبال	۲ آنہ
۱۹- جواب شکوہ	۴ آنہ
۲۰- شمع و شاعر	۲ آنہ
۲۱- بلال	۱ آنہ
۲۲- اکبری اقبال	۳ آنہ
۲۳- تصویر درد	۴ آنہ
۲۴- حیات خسرو	۸ آنہ
۲۵- نظام حیات انسانی	۸ آنہ

———:o:———

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر - دلچسپ - پراز معلومات اور بہترین مجموعہ - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ - ریاست بھوپال ۱ روپیہ

———:o:———

المشتہر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱-یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری-اپریل-جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا—

۲-یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہو گی-حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو صفحے ہو گا—

۳-بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے—

۴-قیمت سالانہ چھہ روپیہ کلدار-محصول ڈاک وغیرہ ملا کر آٹھہ روپیہ کلدار (سکۂ عثمانیہ سات روپیہ-محصول ڈاک وغیرہ ملا کر نو روپیہ سکۂ عثمانیہ)

۵-تمام خط و کتابت:-آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے—

(باھتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس-اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔